یکم دسمبر ۲۰۱۶ء | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | جلد نمبر: ۹ ۔ شمارہ نمبر: ۲۳

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیر: غیاث الدین

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱ـ۳۶۳۴۹۸۴۰(۲۱ـ۹۲)، فیکس: ۳۶۳۶۱۰۴۰
برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے' جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون' نقطۂ نظر' خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں' اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۴ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید' لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

رجب طیب ایردوان کا سفر!

Halil Karaveli

رجب طیب ایردوان کو آخر کیا ہو گیا ہے؟ ۲۰۰۳ء میں جب وہ برسرِ اقتدار آئے تھے تب اس بات کی بھرپور توقع تھی کہ ترکی میں بڑے پیمانے پر سیاسی اور معاشی اصلاحات نافذ کی جائیں گی مگر اس کے بجائے ترکی لبرل طریق سے ہٹ کر خالص آمرانہ اور مطلق العنان حکمرانی کی سمت گیا ہے۔ ویسے ایردوان کے دور میں سخت گیر قسم کی اسلامی حکمرانی کی گنجائش پیدا نہیں ہوئی جیسا کہ ان کا پس منظر دیکھتے ہوئے خدشہ ظاہر کیا جا رہا تھا۔ اس کے بجائے رجب طیب ایردوان مشرق وسطیٰ کے روایتی حکمران کی حیثیت سے ابھرے ہیں جو بیشتر اختیارات اپنی ذات میں مرتکز کر لیتا ہے، مخالفین اور منحرفین کو کچلنا جس کا مشرب ہو جاتا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ چند ماہ قبل حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کو ناکام بنانے کے بعد ایردوان نے فوج کے چند اعلیٰ افسران کے خلاف کارروائی تک محدود رہنے کے بجائے فتح اللہ گولن کی تحریک کے خلاف کچھ زیادہ ردِعمل ظاہر کیا۔ یہ بات بہت حیرت انگیز تھی کہ ایردوان نے حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش (فوجی بغاوت) کو ناکام بنانے میں تیزی سے اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔ انہیں ایک طرف تو فوج کے اندرونی حلقوں سے مدد ملی اور دوسری طرف عوام بھی بڑی تعداد میں سڑکوں پر نکل آئے اور کھل کر ایردوان اور ان کے رفقاء کی حمایت کی۔ فوجی بغاوت کو کچلنے میں ایردوان نے جس تیزی سے جو کامیابی حاصل کی اس سے اندازہ ہو گیا کہ ان کے سخت ترین مخالفین جو کچھ بیان کرتے ہیں اس کے برعکس اقتدار پر ان کی گرفت غیر معمولی حد تک مضبوط ہے۔

ترکی میں اور اس کے باہر کسی نے بھی نہ تو فوجی بغاوت کے بارے میں سوچا تھا نہ اس کے نتائج و انجام کے بارے میں۔ ترکی کے لبرل عناصر کو تھوڑی بہت مایوسی ضرور ہوئی ہے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ ایردوان ترکی کو شدت پسند اسلامی ریاست میں تبدیل نہیں کریں گے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایردوان نے کبھی ترکی کو شدت پسند اسلامی ملک بنانے کی کوشش نہیں کی مگر ساتھ ہی ساتھ وہ ترکی کو خالص لبرل ملک کے روپ میں بھی دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ ترکی کے لبرل عناصر کی خواہش رہی ہوگی کہ ایردوان ملک کو ترقی کے اس ماڈل کی طرف لے جائیں جس میں لبرل ازم کو زیادہ نمایاں مقام حاصل ہو۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔

ایردوان نے اب تک دو بنیادی مقاصد کے لیے جدوجہد کی ہے۔ ایک طرف تو وہ ملک کو رجعت پسند یا قدامت پسند روایات کے ساتھ ساتھ ترقی دینے کی کوشش کرتے رہے ہیں اور دوسری طرف انہوں نے ملک کی لسانی اقلیتوں بالخصوص کردوں سے تعلقات بہتر بنانے پر خاص توجہ دی ہے۔ ایردوان کی سوچ یہ رہی ہے کہ ملک میں اکثریت سُنّیوں کی ہے اور اس حقیقت کو وہ ملک کے لیے تقویت بخش طاقت کے طور پر بروئے کار لانے میں کامیاب رہیں گے۔ مگر چند برسوں کے دوران ملک میں جو تھوڑی بہت اندرونی تقسیم دکھائی دی ہے اس کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اس اپروچ میں وہ کسی حد تک ناکام رہے ہیں۔

اسلام نواز؟ لبرل؟ یا مطلق العنان؟

ترکی میں کبھی کوئی لبرل لیڈر نہیں ہوا۔ ۱۹۲۰ء کے عشرے میں سلطنتِ عثمانیہ کے خاتمے کے بعد کمال اتاترک نے ملک کو نئے خطوط پر استوار کیا اور ترقی بھی دی مگر خیر وہ لبرل لیڈر نہیں تھے۔ انہیں مطلق العنان قرار دیا جا سکتا ہے۔ کسی بھی ترک حکومت نے اظہار رائے کی آزادی دی ہے نہ اقلیتوں کے حقوق کا احترام کیا ہے۔ ترکی میں فوج کی حکومت رہی ہو یا سیاست دانوں کی، سبھی نے ریاستی اداروں، رجعت پسندی، قوم پرستی اور مذہبیت کو اولیت دی ہے۔ اور ہاں، کاروباری مفادات کو بھی پالیسیوں میں نمایاں مقام حاصل رہا ہے۔

اقتدار میں آنے کے بعد ابتدائی دور میں ایردوان نے یہ تاثر دیا کہ وہ دوسروں سے ہٹ کر ہیں اور غیر روایتی اسلام نواز حکمران ثابت ہوں گے۔ ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء میں استنبول کے میئر کی حیثیت سے ایردوان نے چند ایک ایسے اقدامات کیے جن سے ان کی اینٹی سیکولر سوچ ابھر کر سامنے آئی۔ انہوں نے ایک آجر کی طرف سے مونچھ منڈوانے کی شرط مسترد کر کے بھی شہرت پائی۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے خواتین کو بھی سیاسی اعتبار سے متحرک کرنے پر توجہ دی۔ یہ کسی حد تک انقلابی اقدام تھا کیونکہ

اندرونی صفحات پر:۔

- تھائی لینڈ: خوشیوں کی سرزمین' غیر یقینی' مستقبل
- یورپی یونین، عالم اسلام اور اصطلاحات
- جمہوریت ''اکثریت کی آمریت''!
- چیچنیا اور کریملن ایک راہ پر
- مستقبل کی افغان ریاست اور طالبان
- شام ''پراکسی جنگ'' کا میدان
- لبنان: مردم شماری اور سمجھداری

انہوں نے استنبول کے میئر کی حیثیت سے انتخاب لڑنے کے دوران اپنے حلقے کی پردہ پوش اور بے پردہ دونوں کی طرح کی خواتین سے کہا کہ وہ سیاست کے ترانے میں اپنی آواز ملائیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ویلفیئر پارٹی کے لیے زیادہ سے زیادہ وسیع بنیاد چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے کارکنوں سے کہا کہ وہ کسی بھی ووٹر سے مذہب یا مسلک کے بارے میں بحث سے گریز کریں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ ہدایت بھی کی گئی کہ جن مقامات پر شراب پی جاتی ہے، وہاں بھی وہ لوگوں کو سلام کریں۔

ایردوان ترکی کو آگے نہیں بلکہ پیچھے لے گئے ہیں

۱۹۹۴ء میں جب وہ استنبول کے میئر منتخب ہوئے تھے تب انہوں نے یہ عندیہ دیا تھا کہ جہاں کہیں بھی ممکن ہوا وہ اسلامی شریعت پر مبنی قوانین نافذ کریں گے اور میونسپلٹی کی ملکیت والی تمام دکانوں اور دیگر مقامات پر شراب کی فروخت پر پابندی عائد کردی جائے گی۔ تب تک یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ترکی کسی حد تک اسلامی اصولوں کے مطابق کام کرنے والی اسلامی ریاست میں تبدیل ہوجائے گا۔ کچھ دن یہ سب دکھائی دیا مگر پھر پرنالے وہیں بہنے لگے۔

۱۹۹۵ء کے انتخابات میں ویلفیئر پارٹی نے سب سے زیادہ ووٹ حاصل کیے اور نجم الدین اربکان نے مخلوط حکومت تشکیل دی۔ ۱۹۹۷ء میں فوج اور اس کے چند سیاسی ساتھیوں نے ملک کر نجم الدین اربکان کو مستعفی ہونے پر مجبور کردیا۔ تب رجب طیب ایردوان نے ایک ریلی کے دوران ایک نظم پڑھی جس میں کہا گیا تھا کہ مساجد ہماری بیرکس، گنبد ہمارے ہیلمٹ، مینار ہمارے بھالے اور اس کاز کے وفادار ہمارے سپاہی ہیں۔ اس نظم کے پڑھنے کی پاداش میں ان پر مقدمہ چلایا گیا اور یوں انہیں ۲۰ ادن جیل میں گزارنا پڑے۔

رہائی کے بعد اربکان نے خود کو رجعت پسند ڈیموکریٹ کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی اور ان لوگوں کے ساتھ کام کرنے میں زیادہ دلچسپی لی جو یورپ اور امریکا کے نظام سے ہم آہنگ ہوکر آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ ایردوان ایک ایسے گروپ کا حصہ بنے جو اسلام نوازوں کے بعد کا اصلاحات پسند گروپ کہلایا۔ اب ایردوان نے یہ کہا کہ وہ ایسے لوگوں کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیتے جو یہ کہتے ہیں کہ ریاست کو شریعت کے بیان کردہ اصولوں کے مطابق چلایا جانا چاہیے۔ یہ تبدیلی کیوں کر رونما ہوئی، اس کی وضاحت ایردوان نے نہیں کی۔ وہ بظاہر حقیقت پسندانہ سوچ کی طرف جانے کا عندیہ دے رہے تھے۔ ۱۹۹۹ء میں استنبول کے بزنس لیڈرز کے ساتھ عشائیے کے دوران انہوں نے کہا کہ انقلاب پسندی سے ہمارے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا۔

۲۰۰۱ء میں اصلاحات کے حامیوں نے ایردوان کی قیادت میں جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی کی بنیاد رکھی، جس نے عام انتخابات میں فقید المثال کامیابی حاصل کی مگر ایردوان ایک قانون کے باعث حکومت میں کوئی منصب حاصل نہ کرسکے۔ ان کی پارٹی کی حکومت نے جب ۲۰۰۳ء میں اس قانون کو ختم کیا تب وہ حکومت کا حصہ بننے کے اہل ہوئے۔ جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی کی مقبولیت میں تیزی سے ابھرتی ہوئی اس مڈل کلاس نے کلیدی کردار ادا کیا، جو بین الاقوامی بازاروں سے ترکی کے وابستہ ہونے کے نتیجے میں ملنے والے غیر معمولی معاشی فوائد سے مستفید ہو رہی تھی۔ مضبوط ہوتی ہوئی یہ مڈل کلاس ترکی کے ہارٹ لینڈ اناطولیہ میں تھی۔ اناطولیہ کو ایک طویل مدت تک پس ماندہ رکھا گیا۔ ۱۹۸۰ء میں ترکی کی ۵۰۰ بڑی کمپنیوں میں سے ایک کا بھی تعلق اناطولیہ کے نمایاں ترین شہروں غازیانیپ یا کونیہ سے نہ تھا۔ ۲۰۱۲ء تک ۳۲ بڑی کمپنیوں کا تعلق ان دونوں شہروں سے تھا۔ اناطولیہ کی تاجر برادری نے روایتی، سیکولر ذہن رکھنے والی تاجر تنظیموں کو ایک طرف ہٹا کر اپنا الگ اتحاد قائم کیا، جو بعد میں جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی کو تقویت بہم پہنچانے کا ذریعہ بنا۔

وزیر اعظم کی حیثیت سے ایردوان نے نئے عمرانی معاہدے کی بات کی تاکہ اختیارات الگ کرنا ممکن ہو۔ انہوں نے عدلیہ اور پریس کو خود مختار بنانے کے ساتھ ساتھ قانون کی حکمرانی کو ہر حال میں مقدم ترین حیثیت دینے کا وعدہ کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ بیرونی سرمایہ کار ترکی میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ کاری کریں اور اس کے لیے وہ موزوں ماحول پیدا کرنے کے بھی حق میں تھے۔ ان کی آرزو تھی کہ ترکی ایک ایسے ملک میں تبدیل ہوجائے، جس میں امن اور سکون ہو اور جو دوسروں کے لیے بھی آسانیاں پیدا کرے، ان میں زیادہ آسانی سے ایڈجسٹ ہوجائے۔ وہ بین الاقوامی اداروں کو ترکی لانا چاہتے تھے اور اس کے لیے درکار ماحول بھی تیزی سے پیدا کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے عہد کیا کہ وہ معیشت پر ریاستی اداروں کی گرفت ڈھیلی کریں گے اور ملک کو ہر معاملے میں غیر معمولی حد تک مداخلت کرنے والی بیوروکریسی سے بچائیں گے۔

ایردوان نے کردوں کی شکایات کم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ سرکاری فورسز اور کردوں کی مرکزی سیاسی جماعت 'پی کے کے' کے درمیان ایک عشرے سے بھی زائد مدت سے جو تصادم چلا آرہا تھا اُسے ختم کرنا لازم تھا۔ اِسی صورت ترکی حقیقی امن اور استحکام سے ہم کنار ہوسکتا تھا اور ہوا۔ انہوں نے ۲۰۱۳ء میں اصلاحات نافذ کیں، جن کے تحت کردوں کو اپنے شہروں کے نام اپنی زبان میں رکھنے کی اور اسکولوں میں کرد زبان کی کلاسیں شروع کرنے کی اجازت دی گئی۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے ایسی آئینی اصلاحات بھی نافذ کیں، جن کی مدد سے کسی بھی سیاسی جماعت کے لیے پارلیمنٹ تک پہنچنا انتہائی پیچیدہ نہ رہا۔ اِسی دوران ایردوان حکومت نے کردوں سے سیاسی مفاہمت کی راہ بھی ہموار کی اور یوں کردوں کے اسیر عسکریت پسند رہنما عبداللہ اوقلان سے رابطے شروع ہوئے۔

سیاست اور معیشت کے معاملے میں ایردوان کردوں کی شکایت دور کرنے میں بہت حد تک ناکام رہے ہیں اور اس کے نتیجے میں جنوب مشرقی ترکی میں لڑائی بھی اب تک تھم نہیں پائی۔ انہوں نے لبرل ڈیموکریسی کی منزل تک پہنچنے کے بجائے اداروں کو قابو میں رکھنے کی زیادہ کوشش کی ہے اور قانون کی حکمرانی بھی داؤ پر لگی ہے۔ یہ سلسلہ ۲۰۰۷ء میں اس وقت شروع ہوا جب ایردوان نے متعدد سیاسی مخالفین کو حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کے الزام میں گرفتار کرکے ان پر مقدمات چلوائے۔ مقدمات کی سماعت متنازع انداز سے ہوئی اور انصاف کی فراہمی ممکن نہ بنائی جاسکی۔ ۲۰۱۲ء میں ایردوان نے شکایت کی کہ اختیارات کا الگ کیا جانا لازم ہے کیونکہ بہت سے معاملات میں عدالتیں رکاوٹ کھڑی کرتی ہیں۔ ترکی میں عدالتیں عمومی سطح پر ریاست کی ہم نوا رہی ہیں مگر ایردوان نے استغاثہ اور عدلیہ کا یہ علامتی کردار بھی ختم کردیا۔

مخالفین اور منحرفین کو کچلنے کے لیے ایردوان حکومت نے انسدادِ دہشت گردی سے متعلق خطرناک قوانین کو مزید سخت کردیا۔ ۲۰۱۲ء تک طلبہ، صحافیوں، ٹریڈ یونین ورکرز اور وکلاء سمیت ۹ ہزار سے زائد افراد دہشت گردی کے الزام کے تحت جیلوں میں پائے گئے۔ صحافیوں کو قید کرنے کے معاملے میں ترکی نے ایران اور چین کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ گزشتہ برس ایردوان نے حکم دیا کہ ان پر تنقید کرنے والے ایک چیف ایڈیٹر کے خلاف براہِ راست مقدمہ چلایا جائے۔ ایردوان نے اعلان کر رکھا ہے کہ وہ ریاستی پالیسی سے انحراف کا عوامی سطح کا مظاہرہ کسی بھی صورت برداشت نہیں کریں گے۔ ۲۰۱۳ء میں استنبول کے غازی پارک میں ایک مظاہرے کو پولیس نے سختی سے کچل دیا تھا۔ اس واقعے میں گیارہ افراد ہلاک اور درجنوں زخمی ہوئے تھے۔

تاریخ کو پڑھنے میں غلطی

ایردوان کی قیادت میں جس ترکی کے ابھرنے کی توقع تھی، اس میں اور موجودہ ترکی میں کیا فرق ہے؟ فرق بہت واضح ہے، یہ کہ ایردوان سب کچھ اپنی ذات میں مجتمع دیکھنا چاہتے ہیں۔ مراد یلگے ترکی کے معروف دانشور ہیں۔ ۲۰۱۳ء

میں استنبول کے غازی پارک میں حکومت کے مخالفین کے خلاف غیر معمولی جبر بروئے کار لائے جانے تک وہ ایردوان کے مداح تھے۔ پھر انہوں نے اپنا راستہ تبدیل کیا۔ اب وہ اس خیال کے حامل ہیں کہ اس وقت ترکی جن مسائل کا سامنا کر رہا ہے وہ ایردوان کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں یعنی کہ ایردوان زیادہ سے زیادہ طاقتور ہونا چاہتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں ایردوان اپنی ذات سے آگے دیکھنے کے عادی ہی نہیں۔

ایردوان نے بیشتر اختیارات اپنی ذات میں جمع کر لیے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے یہ سب کچھ تن تنہا کر لیا۔ لبرل عناصر نے ابتدا میں ان کا کھل کر خیر مقدم کیا تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ سب کچھ ویسا ہی چلتا رہے گا، جیسا بیان کیا جا رہا ہے۔ مگر وہ تاریخ کو پڑھنے میں غلطی کر گئے۔ کمال اتاترک سخت سیکولر تھے مگر ۱۹۳۸ء میں ان کے انتقال کے بعد ترکی میں سیکولرازم کو بہت حد تک خیر باد کہتے ہوئے معاشرے کے بنیادی کردار یعنی اسلامی روایت کو اپنایا گیا۔ ملک کے تعلیمی نظام میں اسلام کو داخل ہونے کا پھر موقع ملا۔ مگر حکومت کو زیادہ پریشانی اس لیے لاحق نہ ہوئی کہ اسلام اس کا براہِ راست دشمن نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ترک اشرافیہ مذہب کو دشمن سمجھنے کے بجائے اثاثہ سمجھتی تھی۔ سرد جنگ کے دور میں ترکی نیٹو کا رکن اور مغرب کا بھرپور ہم نوا تھا۔ سابق سوویت یونین کے خلاف اس نے مغرب کا کھل کر ساتھ دیا۔ اس دور میں ترکی میں بائیں بازو کے بہت سے لوگوں کو پوری قوت سے کچل دیا گیا۔ ۱۹۸۰ء میں فوجی بغاوت کے ذریعے منتخب حکومت کا تختہ الٹنے والے جنرل کنعان ایورن نے برملا کہا تھا کہ اسلام ہمارا اثاثہ ہے اور ہم کسی بھی صورت مذہب سے دور ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔

۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کی اینٹی لیفٹسٹ تحریکوں کے دوش پر چلتے ہوئے ایردوان نے ابتدائی دور میں اپنے نظریات مرتب کیے۔ انہوں نے ہائی اسکول میں دائیں بازو نیشنل ٹرکش اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن میں شمولیت اختیار کی، جس نے اشتراکیت کو اپنا سب سے بڑا دشمن قرار دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اشتراکیت کو ختم کرنے کی صلاحیت صرف اسلام میں ہے اور اشتراکیت کے خلاف لڑائی بھی ویسی ہی مفید ہے جیسی نماز ہوا کرتی ہے۔ اس طلبہ تنظیم نے ملک کو صفِ اول کے سیاست دان دیے ہیں۔ ۲۰۰۷ء سے ۲۰۱۴ء تک ترکی کے صدر کے منصب پر فائز رہنے والے عبداللہ گل، ۲۰۰۹ء سے ۲۰۱۵ء تک ایردوان کے ماتحت یعنی نائب وزیراعظم کے منصب پر فائز رہنے والے بلند ارنک اور ترک پارلیمنٹ کے موجودہ اسپیکر اسماعیل کہرامن ..... سبھی اس طلبہ تنظیم میں مختلف کلیدی عہدوں پر رہے ہیں۔ اس تنظیم نے لبرل ازم کے بجائے اینٹی کمیونزم اور اسلامک نیشنل ازم کو پروان چڑھانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

ایردوان کے اقتدار میں آنے پر مغرب میں چند ایک تجزیہ کاروں نے امید ظاہر کی تھی کہ وہ بند معیشت کو کھولیں گے اور سیاسی سطح پر متعدد اصلاحات کی راہ ہموار کریں گے۔ مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ ان کے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ ملک میں مجموعی طور پر کوئی ایسی بڑی تبدیلی رونما نہ ہوئی، جس کی بنیاد پر کہا جا سکے کہ ترکی ریاست کی حیثیت سے مستحکم ہوا ہے۔

سبق جو نہیں سیکھے گئے

اسلامی دنیا میں طوائف الملوکی عام ہے۔ ترکی میں بھی اس کا خطرہ محسوس کیا جاتا رہا ہے۔ ترک عوام مزاجاً ایک ایسے نظام کو پسند کرتے ہیں، جس میں ریاست کو اولیت دی جائے۔ مرکزی اتھارٹی کو چیلنج کرنے والوں کو پسند نہیں کیا جاتا۔ اگر لبرل ازم یا سیکولرازم نمایاں رہا تو اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ لوگ انہیں بھی اس شرط پر قبول کرنے کو تیار تھے کہ ریاست کی اتھارٹی برقرار رہے یعنی بنیادی مسائل حل ہوتے رہیں، معاشرے میں انتشار پیدا نہ ہو۔ ترک عوام کا مجموعی مزاج یہ رہا ہے کہ کسی بھی حال میں ریاست کے خلاف نہ جایا جائے۔ اسی خصوصیت کا جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

ایردوان کے ہیرو عدنان میندرس ہیں، جو ۱۹۵۰ء میں ملک کے پہلے باضابطہ منتخب وزیراعظم بنے۔ وہ بھی مخالفین کو برداشت نہیں کرتے تھے اور صحافت پر قدغن لگاتے تھے۔ انہوں نے سسٹم کے مخالفین کو سختی سے کچلا۔ ۱۹۶۰ء میں انہوں نے کہا کہ جمہوریت کے نام پر ریاست کے خلاف جانا کسی بھی طور برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اور پھر اسی سال ایک فوجی بغاوت میں ان کا تختہ الٹ دیا گیا اور اگلے سال انہیں پھانسی دے دی گئی۔

عدنان میندرس کی پھانسی کا ایردوان پر بہت گہرا اثر مرتب ہوا تھا۔ ۲۰۰۹ء میں ترکی کے مشہور اخبار ''ترکمان'' سے انٹرویو میں ایردوان نے بتایا تھا کہ عدنان میندرس کو تختہ دار پر لے جانے کا منظر ان کے والدین اور خود ان کے لیے انتہائی دل دکھا دینے والا تھا۔ ایردوان نے اپنے ہیرو سے سبق نہیں سیکھا۔ انتشار یعنی فتنہ روکنے کے لیے عدنان میندرس نے خود بھی فتنے کا ارتکاب کیا تھا۔ وہ سخت حکمرانی کی دوڑ میں بہت آگے نکل گئے تھے۔ جولائی ۲۰۱۶ء میں ترکی میں جو کچھ ہوا وہ عدنان میندرس کے دور والے حالات ہی کا عکس تھا۔ عدنان میندرس کی سخت گیر حکمرانی سے تنگ آ کر چند فوجی افسران نے بغاوت کی تھی۔ جولائی ۲۰۱۶ء میں بھی یہی ہوا۔ چند فوجی افسران نے ایردوان کے سخت گیر رویے سے تنگ آ کر حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ ایردوان نے تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔

ایردوان کی فکری تربیت ایک ایسے دور میں ہوئی جب کمال ازم دم توڑ رہا تھا اس کی جگہ اسلام پسندی نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔ مگر بعد میں ثابت ہوا کہ یہ معاملہ مذہب سے زیادہ لسانیت کا تھا۔ ترک معاشرے میں بڑھتی ہوئی اسلام پسندی دراصل ایک واضح اکثریت کی زبان اور ثقافت کی بنیاد پر تھی۔ کردوں کے معاملے کو ایردوان نے جس انداز سے نمٹانے کی کوشش کی ہے اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔

ایردوان نے جوانی کے زمانے میں جو کچھ پڑھا تھا، اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان پر اسلامی فکر کے اثرات گہرے ضرور تھے مگر وہ بہت سے معاملات میں مختلف تھے۔ مثلاً انہیں دوسرے معاشروں اور ثقافت سے تعلق رکھنے والوں سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ استنبول سے تعلق رکھنے والا ایک یونانی فٹبالران کا ہیرو تھا۔ وہ ترکی سے بچے کھچے یونانیوں کو نکالنے کی کسی بھی مہم یا تحریک کے مخالف تھے۔ ایردوان کی والدہ کا تعلق روسی خطے کی ریاست جارجیا سے تھا۔ اپنے والد کے ثقافتی پس منظر کے بارے میں ایردوان نے کچھ زیادہ فخر کا اظہار نہیں کیا۔ اس اعتبار سے وہ پہلے ترک لیڈر ہیں، جس نے اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں کھل کر کہنے اور پرسکون محسوس کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی۔ ان کے خاندان کا تعلق اصلاً بحیرۂ اسود کے خطے سے ہے۔ اس خطے کے لوگ ''لیز'' کہلاتے ہیں۔ ایردوان بتاتے ہیں کہ انہوں نے اپنے والد سے بھی پوچھا تھا کہ ہم لوگ ترک ہیں یا لیز۔ والد نے بتایا کہ انہوں نے بھی اپنے والد سے یہ سوال پوچھا تھا۔ جواب پڑ دادا کی طرف سے آیا تھا، جو عالم دین تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ

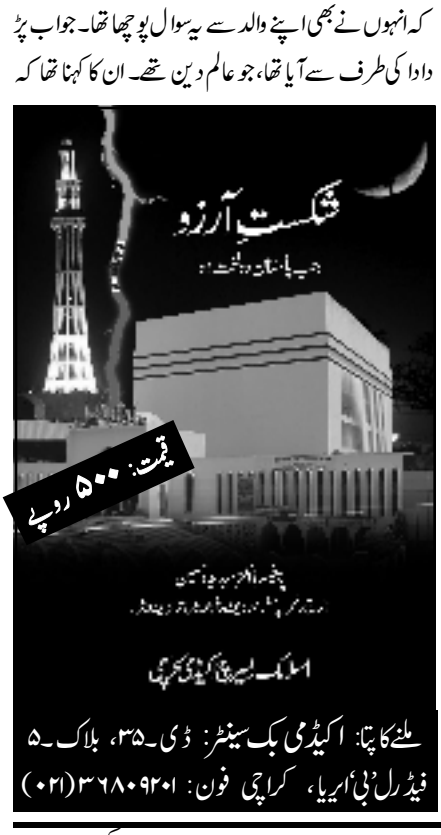

ملنے کا پتا: اکیڈمی بک سینٹر: ڈی۔۳۵، بلاک۔۵
فیڈرل بی ایریا، کراچی فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱(۰۲۱)

ہمیں اس بات کی زیادہ فکر نہیں کرنی چاہیے کہ ہم ترک ہیں یا نہیں بلکہ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہم مسلم پیدا ہوئے ہیں اور یہی اللہ کا خاص کرم ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایردوان نے کردوں سے مفاہمت کے لیے جو کوشش کی، وہ سنجیدہ تھی اور وہ واقعی خطے میں امن چاہتے تھے مگر وہ ایک نکتہ فراموش کر گئے۔ ان کے ذہن میں یہ بات نہ رہی کہ کردوں کو واضح سیاسی رعایتیں دیے بغیر اور ان کی ترقی کا سامان کیے بغیر وہ کچھ حاصل نہ کرسکیں گے۔ کرد بھی مسلم ہیں اور یہ سوچ لینا سادگی کی انتہا تھی کہ وہ اسلام کو ذہن نشین رکھتے ہوئے بہت سے معاملات میں سمجھوتہ کرلیں گے۔ کرد زیادہ خود مختاری اور معاشی ترقی چاہتے تھے۔ محض مفاہمت سے انہیں کیا ملنے والا تھا؟ ایردوان کردوں کو خود مختاری کسی بھی قیمت پر نہیں دینا چاہتے تھے۔

کوئی راستہ نہیں بچا

ایردوان ترکوں کے لیے نئے بابائے قوم بننا چاہتے تھے مگر مخالفین کے خلاف غیر معمولی قوت استعمال کر کے وہ اپنی اس خواہش کی تکمیل نہیں کرسکتے۔ ترک کیپٹل ازم اور سنی شناخت کو ایک پیج پر لانے کی کوشش اکیسویں صدی میں ترکی کے لیے ایک نئی پہچان قائم کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اب ایردوان کے پاس صرف ایک آپشن بچا ہے...... روایتی جابرانہ قوم پرستی کی طرف چلے جائیں۔ ایک طرف تو ایردوان کا اختیارات کو اپنی ذات میں جمع کرنا ہے اور دوسری طرف عوام میں پائی جانے والی بھرپور ریاست پرستی ہے۔ لوگ کسی بھی طرح ریاست کے خلاف جانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طور انتشار کو ٹالا جاتا رہے اور ملک کا نظام چلتا رہے تاکہ معاملات خراب نہ ہوں، بنیادی مسائل حل طلب ہی نہ رہ جائیں اور عالمی برادری میں ملک کی پوزیشن متنازع نہ ہو۔

ایردوان نے لبرل ڈیموکریسی کو ختم کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اب اگر کوئی خرابی پیدا ہوگی تو مخالفین کو کچلنے کی پریکٹس ہی کے بطن سے پیدا ہوگی۔ جن لوگوں کو ایردوان نے بری طرح دبا کر رکھا ہے وہی کسی بڑی تبدیلی کی راہ ہموار کریں گے۔ کردوں میں پائی جانے والی بے چینی بھی ترکی میں حقوق کے لیے جاری جدوجہد کو ہوا دے سکتی ہے۔ اگر کرد اپنے حقوق کی جنگ کو ذرا وسیع بنیاد فراہم کریں تو کوئی سبب نہیں کہ ملک بھر میں ان کی جدوجہد کو غیر معمولی مقبولیت حاصل نہ ہو۔ لوگ اپنے بہت سے حقوق کی بحالی چاہتے ہیں اور اس کے لیے انہیں موزوں پلیٹ فارم درکار ہے۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Erdogan's Journey: Conservatism and authoritarianism in Turkey". ("Foreign Affairs". November/December2016)

سولہ دسمبر پھر آرہا ہے!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

عزیزم/ برادرم/محترم !!

ایک تجویز پیش کرنے کی جسارت کررہا ہوں:-

سولہ دسمبر کا دن پھر آرہا ہے۔

اب سے ۴۵ سال قبل، ہمارے مُلک کو بیرونی مُداخلت اور عسکری جارحیت کا سنگین اور ہولناک سامنا کرنا پڑا تھا۔ ۱۶ دِسمبر ۱۹۷۱ء کو ڈھاکا پر، جارح ہندوستانی فوج کا قبضہ مکمل ہوا تھا، اور دِفاعِ پاکستان پر مامور افواج کو ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔

المیہ یہ ہے کہ ہماری قوم، اِس سانحہ کو بُھلا بیٹھی ہے۔ ہمارے اجتماعی ضمیر و نفسیات میں اور ہمارے قومی شَعور و اِدراک میں، اِس عبرت ناک واقعہ کا، کوئی اثر، کوئی عمل دخل ہی نہیں۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں، اِس ''بُھلاوے'' کا بھی، بڑا عیّارانہ، بے رحمانہ اور بھرپور اہتمام کیا جاتا رہا ہے۔

وائے ناکامی، مَتاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دِل سے، اِحساسِ زِیاں جاتا رہا!!

نیتجتاً آج ہمارے نوجوان، اپنی مِلّی تاریخ کے اِس دردناک باب سے ناواقف، یا کم ہی آگاہ ہیں۔

لہٰذا ایک عاجزانہ رائے ہے کہ کم از کم ہم لوگ، اپنے خاندان کے بچّوں اور بچّیوں کو، ۱۶ دسمبر یا اُس کے آس پاس، کھانے پر جمع کریں۔ اُنھیں پاکستان حاصل کرنے، اور بعد میں اِس کی حفاظت نہ کرسکنے کی تاریخ کے کچھ اَبواب، کچھ حصّے، کچھ قصّے سُنائیں، سمجھائیں، یاد کرائیں۔ تاکہ ہماری اگلی نسلوں کے اجتماعی ضمیر میں، شعور و اِدراک میں، اِس دردناک، چشم کُشا اور سبق آموز واقعہ کی آگہی، شِدّتِ احساس اور قُوّتِ عمل بخشنے والی خَلِش، زندہ بھی رہے اور کارفرما بھی ہو۔

اِس عاجز کی رائے ہے کہ ہمیں سارے کام، اہلِ اِختیار واقتدار پر نہیں چھوڑ دینے چاہئیں۔ نجی سطح پر، خود بھی کچھ اچھی رِوایات کی داغ بیل ڈالنی چاہیے۔ اِس سے مُعاشرہ میں اچھی رِوایت کا آغاز ہوسکتا ہے۔

خُدا کرے کہ اِمسال، ہماری حکومت، اِسٹیبلشمنٹ اور ذرائع ابلاغ، سُقوطِ مشرقی پاکستان کے سانحہ کو بُھلانے، دَبانے، یا اس سے نظریں چُرانے کی غلطی نہ کرے۔

اللہ کریم، مُلک و مِلّت و بَنی آدَم کو، خیر و برکت و عافیت سے نوازیں۔ شکریہ!

والسلام !!

شاہد ہاشمی۔ کراچی

بقیہ: جمہوریت ''اکثریت کی آمریت''!

استثنا کی بنیاد پر نہیں۔ اگر دنیا میں چند افراد آدم خور پائے جاتے ہوں تو کیا یہ مان لیا جائے کہ اکثریت اسی وجہ سے قابل بھروسہ نہیں رہی کہ ان میں چند افراد آدم خور بھی ہیں؟

جمہوریت کے بارے میں ناقدین کا رویہ وہی ہے جو مذہب بیزار لوگوں کا مذہب کے بارے میں۔ وہ مذہب کی ایک خود ساختہ تعبیر کرتے اور اس کے ساتھ چند اہل مذہب کے قابلِ اعتراض رویے کو بنیاد مان کر، مذہب کی نفی کرنا چاہتے ہیں۔ جس طرح مذہب کا مقدمہ اس رویے سے غلط ثابت نہیں ہوسکا، اسی طرح جمہوریت کا مقدمہ بھی خود ساختہ تعبیرات سے غلط ثابت نہیں ہوسکتا۔

(بشکریہ: روزنامہ ''دنیا'' کراچی۔ ۱۶ نومبر ۲۰۱۶ء)

بقیہ: یورپی یونین، عالم اسلام اور اصطلاحات

لے رہے ہیں کہ آیا سیاسی سطح پر درست اصطلاحات کے استعمال سے یورپ اور مسلم ممالک کے مابین موجودہ تناؤ کو کم کرنے میں کوئی مدد ملتی ہے یا نہیں، وہاں وہ اپنے طور پر بھی اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کررہے ہیں۔ ان دونوں عہدیداروں نے گزشتہ ماہ Salzburg میں یورپی یونین کے وزرائے خارجہ سے کہا کہ یورپی یونین کو اقوام متحدہ، عرب لیگ اور اسلامی کانفرنس تنظیم کے ساتھ مل کر مسلم ممالک کے ساتھ اعتماد کے رشتہ کو بحال کرنے کے لیے کام کرنا ہوگا۔ ان کی طرف سے یورپی دارالحکومتوں کو ارسال کی جانے والی مجوزہ حکمت عملی میں بھی کہا گیا ہے کہ خارجہ پالیسی کے تحت کیے جانے والے اقدامات کی مزید تائید داخلی سطح پر سخت قانون سازی کے ذریعے سے کی جانی چاہیے جس کے تحت اسلام کے بارے میں پائے جانے والے خوف کا تدارک کیا جاسکے اور یورپ میں مقیم مسلمانوں کے ساتھ مکالمہ کی فضا کو بہتر بنایا جاسکے۔

یہ اقدامات اور نئی اصطلاحات کا استعمال سالوں پر محیط غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے کافی نہیں ہوں گے۔ یورپی یونین کے کارپردازوں کا اعتراف ہے کہ مسلم ممالک کے ساتھ تعلقات کو از سر نو بحال کرنے کی جدوجہد طویل اور کٹھن ہوگی اور یورپی مسلمانوں کو مرکزی دھارے میں شامل کرنے کے لیے بھی صبر و حوصلہ اور ثابت قدمی سے کام لینا ہوگا۔ تاہم متفکر یورپی پالیسی ساز اس بات سے بھی خبردار کرتے ہیں کہ آغاز کہیں نہ کہیں سے کرنا ہی ہوگا۔ بہت سے لوگوں کو امید ہے کہ الفاظ اور اصطلاحات میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ اہل یورپ کے اسلام اور مسلمانوں سے متعلق فرسودہ اور بالعموم تعصب پر مبنی خیالات میں بھی تبدیلی رونما ہوگی۔

(بحوالہ: "alsharia.org")

تھائی لینڈ: خوشیوں کی سرزمین 'غیر یقینی' مستقبل

Hannah Beech

غم کی رسومات دھیان بٹانے کا باعث بنتی ہیں۔جیسا کہ تھائی لینڈ کا معاملہ ہے، جہاں طویل ترین مدت تک بادشاہ رہنے والے بھومی بل ادلیادیج ۱۳؍اکتوبر کو ۸۸ سال کی عمر میں انتقال کر گئے ،ان کی تدفین کی رسومات کے موقع پر فضاسوگوار تھی۔ ان کی وفات کے ایک دن بعد، لاکھوں کی تعداد میں سیاہ پوش سوگواران نے تھائی لینڈ کے دارالحکومت، بینکاک کے شاہی محل کے قریب جمع ہوکر اپنے معزز بادشاہ کو خراج تحسین پیش کیا،جس نے ۷۰ سال حکومت کی تھی۔ایک ۵۸ سالہ مساج کرنے والے بوڑھی خاتون شاہی محل کے باہر صبح سویرے سسکیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ ''ہم نے اپنا باپ کھودیا ہے''۔اور'' میں اس ڈراؤنے خواب سے بیدار ہوناچاہتی ہوں''۔

شاہی محل کے مندر میں نامزد ولی عہد نے اپنے والد کو خوشبووالے پانی سے غسل دیااوران کے بال سنوارے۔پھر اس نے کنگھے کے دوٹکڑے کردیے۔بادشاہ بھومی بل اب ایسی دنیا کی طرف چلے گئے جہاں جسم کوئی معنی نہیں رکھتے۔جب کوئی بادشاہ وفات پاتا ہے تو تھائی زبان میں کہا جاتا ہے کہ وہ ''جنت کی طرف لوٹ گیا''۔اب بدھ سادھو ۱۷۲ دنوں تک چکری خاندان کے اس نویں بادشاہ کے لیے دعائیں مانگتے رہیں گے۔یہ ان کی ۸۰۰ سال پرانی روایت ہے۔لکڑیوں کا ڈھیر لگا کر بادشاہ کی میت کو اس میں رکھا جائے گا اور پھر اسے جلایا جائے گا جیسا کہ لارڈ بدھا اس سے قبل جلایا گیا تھا۔ آخری تدفین کی کوئی تاریخ مقرر تو نہیں البتہ اتنا ضرور ہے کہ کم ازکم ایک سال سے پہلے یہ متوقع نہیں۔

تھائی لینڈ قومی سطح پر سوگ منا رہا ہے۔سرکاری طور پر اس سوگ کا دورانیہ ۱۲ ماہ پر محیط ہوگا۔تھائی لینڈ کی عوام نے اپنی فیس بک پروفائل پر لگی تصاویر تبدیل کرکے کالی تصاویر لگا دیں۔بادشاہ کی وفات کے بعد بنکاک کے زیادہ تر شہریوں نے سیاہ کپڑے زیب تن کیے ہوئے تھے۔دکانداروں نے اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے بڑھتی ہوئی مانگ کے پیش نظر اپنی دکان پر رکھے انسانی مجسموں کو سوگ کا لباس پہنادیا تھا ۔سرکاری ملازمین تو ایک سال تک اس لباس میں رہنے کے پابند ہوں گے۔اگلے ایک ماہ تک تھائی لینڈ میں تمام تر تفریحی سرگرمیوں کو ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔قومی ٹی وی پر ڈانس دکھانے پر پابندی ہوگی۔

تھائی لینڈ کا سرکاری طور پر منائے جانے والا غم دراصل ان کا حقیقی غم ہے،لیکن یہ غم قوم کے مستقبل کے حوالے سے پائے جانے والے خدشات سے توجہ ہٹانے کا باعث بھی بنتا ہے۔تھائی بادشاہ بہت عرصے سے بیمار تھے اوران کی موت متوقع تھی۔لیکن ان کی موت نے عوام کو گہرے غم میں ڈبودیا ہے۔ بادشاہ کی طویل علالت کے دوران تھائی لینڈ میں فسادات جاری رہے۔ایک طرف شاہی اشرافیہ تھی تو دوسری طرف تھاکسن شیناوترا کے حامی جو کہ سابق وزیراعظم ہیں اور جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ان کی عدم موجودگی میں انھیں بدعنوانی کے الزامات پر سزا بھی سنائی جا چکی ہے۔ تھاکسن ایک عرب پتی شخص ہیں، جوعوام میں کافی مقبول ہیں۔۲۰۰۶ء کی فوجی بغاوت میں انھیں معزول کردیا گیا تھا۔ اور۲۰۱۴ء کی خفیہ بغاوت میں دوبارہ منتخب ہونے والے ان کے حامی گروہوں کو بھی حکومت سے فارغ کردیا گیا۔

اس وقت سے اب تک جنوب مشرقی ایشیا کے اس ملک پر فوجی حکومت کا راج ہے۔جو''قومی کونسل برائے امن و سلامتی'' کے نام سے حکومت کرتی ہے۔فوجی حکومت نے مخالفین کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور تھائی عوام نے مستقل سیاسی افراتفری کی وجہ سے فوج کے خلاف کسی بڑے ردعمل سے گریز کیا۔انتخابات کو ۲۰۱۷ء کے آخر تک ملتوی کردیا گیا ہے۔ایک سابقہ تھائی سفارت کار جو آج کل یونی ورسٹی آف کیلی فورنیا سے تعلق رکھتے ہیں،ان کا کہنا ہے کہ ''تدفین کی رسومات کے دوران کوئی بھی ملک کے مستقبل کے حوالے سے بات نہیں کرے گا''۔ تھائی لینڈ کی فوجی حکومت اس سفارت کار کا پاسپورٹ منسوخ کرچکی ہے، کیوں کہ انھوں نے حکومت پر تنقید کی تھی۔ان کا کہنا ہے کہ فوج ملک کا اقتدار سنبھال کر اپنے آپ کو قوم کے بہترین منصف کے طور پر پیش کرنا چاہتی ہے،اور یہ بات جمہوریت کے لیے مفید نہیں''۔

پچھلے کچھ سالوں سے تھائی لینڈ سیاسی احتجاج کے باعث مفلوج ہے، بالخصوص جب سے آمدنی عدم مساوات کا شکار ہے۔درجنوں افراد تشدد کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔ سربراہان کو ووٹ ڈالنے سے روکنے کی بارہا کوششیں فوجی بغاوت کی صورت میں ہوتی رہیں۔ بادشاہ بھومی بل کے بعد، جوفوج پر نظر رکھتے تھے اورغریب اوراحساس محرومی کا شکارعوام کا سہارا تھے،اب قوم تقسیم کا شکار ہوجائے گی۔۵۵ سالہ وزارتِ تجارت کے ملازم نے بادشاہ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ''میں پریشانی کی وجہ سے ساری رات سونہیں سکا۔قطع نظر ان کی سیاسی وابستگی کے، لوگ انھیں پسند کرتے تھے۔ مجھے نہیں معلوم اب کیا ہوگا کہ جب وہ نہیں رہے ہیں۔''

آخری فوجی بغاوت کے سربراہ آج کل تھائی لینڈ کے وزیراعظم ہیں۔انھوں نے امریکا سے اپنے آپ کو دور کر کے چین کو گلے لگایا ہے۔عالمی مخالفت کے باوجود انھوں نے بیجنگ کو خوش کرنے کے لیے چینیوں کی سیاسی پناہ کی درخواستیں رد کردی ہیں اوران کے پناہ گزین واپس بھیج ہیں۔تھائی لینڈ کی معیشت کا دسواں حصہ سیاحت پر انحصار کرتا ہے۔اس سال متوقع سیاحوں کی تعداد ۳۳ ملین ہے۔ان میں سے چین سے آنے والے ۳۰ فیصد ہوتے ہیں۔جیسے جیسے تھائی لینڈ چین کی آغوش میں آتا جارہا ہے ویسے ہی امریکا کی خارجہ پالیسی کو نقصان ہورہا ہے۔کیوں کہ اس وقت امریکا کو چین سے نمٹنے کے لیےاورجنوبی چین کے سمندر پر چینی اثرورسوخ کے خاتمے کے لیے خطے میں جو مدد درکار ہے، وہ کھوتا جارہا ہے۔

تھائی معاشرے کی بنیاد تین چیزوں پر ہے۔بادشاہت، فوج اورعوام۔۱۹۴۶ء میں اپنے بڑے بھائی کے قتل (ان کی لاش بستر پر ملی تھی ،انھیں گولی ماری گئی تھی) پر جب بھومی بل غیر متوقع طور پر تخت نشین ہوئے،تو بادشاہت ریاست پر اپنی طاقت کھو رہی تھی اور اقتدار کے بھوکے جنرل اختیارات پر قابض ہورہے تھے۔لیکن جب سرد جنگ نے جنوب مشرقی ایشیا کو پراکسی جنگ کا میدان بنایا،تو امریکا کو کسی دور میں سیام کہلانے والی اس باشاہت کے حوالے سے پریشانی لاحق ہوئی۔قوم کے امریکی نژاد بادشاہ ،جسے موسیقی اور اپنی خوبصورت بیوی سے بہت لگاؤ تھا،اس نے امریکا کو یقین دلایا کہ وہ اپنی ریاست یعنی تھائی لینڈ کو اشتراکی بلاک کا حصہ نہیں بننے دے گا۔واشنگٹن کی حمایت اوراس کی اپنی سیاسی فراست سے نوجوان بادشاہ نے ایک مثالی بادشاہت کی بنیاد رکھی۔ جہاں فوج کو بھی آئینی اختیارات دیے گئے اورفوج

نے بھی بادشاہت کی حفاظت اور حمایت کا یقین دلایا۔

بھومی بل نے اس امریکا کی امیدوں کو خاک میں ملادیا، جس کی مدد سے غربت کا شکار اور کمیونزم کی طرف جھکاؤ رکھنے والے علاقوں میں بادشاہ کی تصویروں والے تھیلوں میں راشن تقسیم کیا جاتا تھا۔ بھومی بل نے یورپ کے پرتعیش ماحول میں اپنی نوجوانی گزارنے کے باوجود، پرآسائش شاہی محل کو چھوڑ کر ملک کے دور دراز علاقوں میں جاکر ترقیاتی منصوبوں کی ازخود نگرانی کی۔ صدیوں سے جاگیردارانہ ماحول میں رہنے والے لوگوں کے لیے بادشاہ کا یہ روپ نیا بھی تھا اور اپنی طرف متوجہ کرنے والا بھی۔

۱۹۷۳ء میں بادشاہ نے جمہوری سوچ کے حامل احتجاج کرنے والے طلبہ کو فوج سے بچایا اور اپنے محل میں پناہ دی تھی، جس سے ان کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوا۔ اس کے تین سال بعد فوج کی جانب سے طلبہ قتل عام ہوا۔ پھر متواتر فوجی بغاوتوں نے کمزور سیاستدانوں کی حیثیت ہی ختم کر دی۔ مگر بادشاہ کا اپنا مخصوص کردار قائم رہا۔ وہ ملکی سیاست سے بالاتر قومی یکجہتی کی علامت بنے رہے۔ ۱۹۹۲ء میں فوج نے دوبارہ نہتے مظاہرین پر گولیاں چلائیں۔ اس واقعہ کے بعد ایک تصویر بہت مشہور ہوئی، جس میں بادشاہ سنجیدہ انداز میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے سامنے فوجی حمایت یافتہ وزیر اعظم اور احتجاجی تحریک کے بدھ راہنما گھٹنوں کے بل بیٹھے ہیں۔ اس کے تصویر کے عام ہونے کے فوراً بعد فوج کے آدمی ''سشندہ کرپایوں'' نے استعفیٰ دے دیا۔ بادشاہ بھومی بل نے کہا کہ ''مغرب مجھ سے پوچھتا ہے کے یہ بالکل متضاد بات نہیں کہ آپ بادشاہ ہیں، لیکن جمہوریت کی حمایت کرتے ہیں، میں ان سے کہتا ہوں کہ تھائی لینڈ میں بادشاہت جمہوریت کی ضامن ہے''۔

جہاں بادشاہ بھومی بل کی شخصیت عوام کی نظر میں سادگی پسند اور غریبوں کی آواز سننے والے بادشاہ کی سی تھی، وہیں ان کا ۶۴ سالہ بیٹا (جو ایک پائلٹ ہے اور جس نے ابتدائی تعلیم برطانیہ اور آسٹریلیا میں حاصل کی ہے) ایک عیاش شخص کی حیثیت سے مشہور ہے۔ جسے چاول کی فصلوں میں گھومنے اور جمہوری اداروں کے حوالے سے بیان دینے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ ۳ شادیاں کرنے والے اس ولی عہد، جس نے کافی عرصہ یورپ میں گزارا ہے، کی ایک وڈیو منظر عام پر آئی، جسے تھائی لینڈ میں نشر ہونے سے روک دیا گیا ہے۔ اس وڈیو میں اسے اپنی اس وقت کی بیوی کے ساتھ اپنے پالتو کتے کو کیک کھلاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اس وڈیو میں اس کی بیوی انتہائی نامناسب لباس میں تھی۔ اس وڈیو کی منظر عام پر آنے کے بعد اس کی بیوی کو ملکہ کے رتبے سے ہٹادیا گیا، جس پر ولی عہد کو بیوی سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔ امریکی سفارتی خفیہ معلومات کے مطابق وہ کتا گزشتہ برس مرگیا، اس کتے کو فوجی عہدہ دیا گیا تھا۔ ولی عہد کے دو سابقہ قریبی ساتھی، جن سے وہ دوری اختیار کر چکا تھا، فوج کی تحویل میں وفات پاگئے۔

بیٹے کی خراب کارکردگی کے باوجود بادشاہ نے واضح الفاظ میں اعلان کر رکھا تھا کہ بادشاہت ان کے بیٹے کو ہی منتقل ہوگی۔ حالانکہ اکثریت ان کی چھوٹی بہن شہزادی ماہا چکری کو یہ منصب دینے کی حمایتی ہے۔ مگر بادشاہ کے انتقال کے کچھ ہی گھنٹوں کے بعد حکومتی راہنما پرایوتھ نے حیرت انگیز اعلان کرتے ہوئے کہا کہ ''ولی عہد موزوں وقت تک کرسی نہیں سنبھالیں گے، کیوں کہ وہ چاہتے ہیں کہ ان کو اس غم سے نکلنے کے لیے کچھ وقت دیا جائے''۔ پرایوتھ نے اس بات پر بھی دباؤ دیا کہ ولی عہد ''وجیرالونگکورن'' کے حوالے سے کسی کوشک میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ اور ۱۸ اکتوبر کو انھوں نے اعلان کیا کہ ولی عہد اسی ماہ کے اختتام تک بادشاہت سنبھال لیں گے (اس سے پہلے تھائی لینڈ کے نائب وزیر اعظم نے بیان دیا تھا کے ولی عہد کو بادشاہت سنبھالنے میں ایک سال کا عرصہ بھی لگ سکتا ہے)۔ اس دوران سابق فوجی افسر اور سابق وزیر اعظم قائم مقام نگراں کی حیثیت سے کام کریں گے، ان کی عمر ۹۶ برس ہے۔

تھائی لینڈ میں عوامی سطح پر اس تخت نشینی کے مراحل پر بھی زیادہ بات نہیں کی جاسکتی۔ فوج کسی کو بھی ''امن و امان'' خراب کرنے کے جرم میں جیل میں ڈال سکتی ہے۔ پرایوتھ کا کہنا ہے کہ ''ان کے پاس اختیار ہے کہ وہ کسی بھی صحافی کو جھوٹی خبر دینے پر سزا دے سکتے ہیں''۔ تھائی لینڈ میں اب بھی شاہی خاندان کے خلاف بات کرنا قابل تعزیر جرم ہے۔ اور جب سے فوجی حکومت آئی ہے اس طرح کے واقعات میں اضافہ ہوا ہے۔ کسی بھی فرد کی جانب سے کسی پر بھی باشاہ، ولی عہد، یا شاہی خاندان کے کسی فرد کے خلاف بات کرنے کا الزام لگایا جاسکتا ہے۔ اس طرح کے ماحول میں افواہیں اور قیاس آرائیاں بڑھ جاتی ہیں۔ اس لیے نگرانی میں بھی اضافہ ہوگیا ہے، کیوں کے جتھوں کی جانب سے ان لوگوں پر حملہ کرنے کے واقعات میں اضافہ ہوا ہے، جن پر یہ شک ہو کہ وہ حکومت یا بادشاہت پر تنقید کرتے ہیں۔ حالانکہ پرایوتھ نے عوام سے اپیل کی ہے کہ ان لوگوں کو نشانہ نہ بنایا جائے جو سوگ کا لباس زیب تن نہیں کر رہے۔ دریں اثنا وزیر انصاف کا کہنا ہے کہ سوگ نہ منانے والوں کو سزا دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان پر معاشرتی پابندیاں لگائی جائیں۔

۲۰۰۵ء میں بادشاہ نے خود کہا تھا کہ وہ بھی تنقید سے بالاتر نہیں ہیں۔ تھائی لینڈ کے سابق وزیر خارجہ نے ۲۰۱۰ء میں امریکا میں لیکچر دیتے ہوئے کہا کہ ''ہمیں شاہی نظام پر بات کرنی چاہیے کہ اسے کس طرح جدید دور سے ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے''۔ انھوں نے مزید کہا کہ ''ہمیں اس بات پر بحث کرنی ہوگی کہ ہم کس طرح کا جمہوری نظام چاہتے ہیں''۔ لیکن چھ سال گزرنے کے بعد بھی تھائی لینڈ میں جمہوریت پنپ نہیں سکی ہے۔ شاہی خاندان پر نظر رکھنے والوں کو اس بات پر تعجب ہے کہ ولی عہد کی تخت نشینی میں تاخیر کا اعلان حکومت کے سربراہ نے کیوں کیا؟ یہ اعلان تو شاہی خاندان کے ترجمان کو کرنا چاہیے تھا۔ یوسف اسحاق انسٹی ٹیوٹ، سنگاپور کے مائیکل مونٹیسانو، جو تھائی لینڈ کے امور پر گہری نظر رکھتے ہیں، کا کہنا ہے کہ ''۲۰۱۴ء کی فوجی بغاوت کے بعد سے فوج اور شاہی شراکت داری میں فوج حاوی ہوگئی ہے، اور یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر بادشاہ کا کردار بالکل کم ہوکر رہ جائے گا''۔

جب بومی پون نے ۷۰ سال پہلے تخت سنبھالا تھا تو شاہی خزانہ تقریباً خالی تھا۔ آج شاہی پراپرٹی بیورو، جو کہ ٹیکس سے مستثنیٰ ہے، کی سرمایہ کاری کے ذریعے یہ دنیا کا سب سے بڑا شاہی خزانہ کہلاتا ہے۔ اس کی مالیت تقریباً ۳۰ ارب ڈالر ہے۔ وفات پا جانے والے بادشاہ کی تصویر تھائی لینڈ کے سکوں پر نمایاں ہے۔ تھائی لینڈ کے اکثر و بیشتر دفاتر اور گھروں میں بادشاہ کی تصاویر لگی ہوئی نظر آتی ہیں۔ لیکن اکیسویں صدی میں بادشاہت پرانے زمانے کی بات لگتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ عوامی سطح پر منائے جانے والا یہ سوگ، جس میں لاکھوں لوگوں نے سیاہ کپڑے پہنے، اس گزر جانے والے سنہری دور کی یاد میں ہے جب بادشاہت دنیا بھر کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا کرتی تھی۔

(ترجمہ: عبدالرحمٰن کامران)

"A tense Thailand mourns its king — and fears for its future". ("Time". Oct. 14, 2016)

یورپی یونین، عالم اسلام اور اصطلاحات

شاداب اسلام

ہوسکتا ہے کہ ساری کوشش کے نتیجے میں محض چند ''نرم اور مہذب الفاظ'' کے علاوہ کوئی چیز وجود میں نہ آئے، تاہم یورپی یونین کے پالیسی سازوں نے، جو مسلم ممالک کے ساتھ مضبوط تر تعلقات قائم کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں، اپنے سر ایک نئی ذمہ داری لے لی ہے۔ یعنی ایسی گائیڈ لائنز کی تیاری جو اسلام کے حوالے سے تحقیر آمیز اصطلاحات کے استعمال کو ممنوع قرار دیں۔ اس کوشش کا اصل ہدف یورپی بلاک کے سرکاری عہدے داروں کے بیانات اور دستاویزات میں ایسے الفاظ کے استعمال سے اجتناب برتنا ہے، جن سے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہو یا یہ تاثر پیدا ہوتا ہو کہ دہشت گردی کے خلاف یورپ کی جدوجہد کا ہدف خاص طور پر مسلمان ہیں۔

اس مہم کا آغاز گزشتہ سال دسمبر میں کیا گیا تھا اور موجودہ حالات میں اس کی اہمیت اور فوری نوعیت (Urgency) اس اعتبار سے بڑھ گئی ہے کہ حالیہ سال کے آغاز میں متعدد یورپی اخبارات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں شائع ہونے والے توہین آمیز خاکوں کی اشاعت کے بعد یورپی یونین مسلم ممالک کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ ان خاکوں کی وجہ سے بہت سے مسلم ممالک میں غم و غصے کی ایک لہر پھیل گئی جس کا نتیجہ پرتشدد مظاہروں، بہت سے مظاہرین کی ہلاکت اور یورپی سفارت خانوں پر حملوں کی صورت میں نکلا۔ یورپی یونین نے ذرا ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرنے اور بہت سے ایسے بیانات جاری کرنے کے بعد جن میں آزادئ صحافت اور آزادئ رائے کے تقدس پر زور دیا گیا تھا، بالآخر اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ ان خاکوں سے بہت سے لوگوں کے جذبات مجروح ہوئے ہیں۔ یورپی یونین کے کمشنر برائے خارجہ تعلقات بینٹا فیریرو والڈنر (Benita Ferrero-waldner) نے ایک حالیہ بیان میں کہا کہ '' آزادئ رائے کے حق پر کوئی پابندی خارج از بحث ہے، لیکن آزادئ مذہب کا حق اور ایک دوسرے کا احترام ملحوظ رکھنا بھی اتنا ہی اہم ہے''۔ انہوں نے کہا کہ '' ہمیں مختلف ثقافتوں اور مذاہب کے مابین، چاہے وہ یورپی یونین کے اندر ہوں یا دنیا میں کہیں بھی، افہام و تفہیم کی فضا کو بہتر بنانے کے لیے مسلسل محنت کرنا ہوگی''۔

خاکوں کی وجہ سے مسلم دنیا کے ساتھ پیدا ہونے والا یہ بحران واقعات کے اس سلسلے کی تازہ ترین کڑی تھا، جس کا آغاز نائن الیون ۲۰۱۱ء کو امریکا پر حملوں سے ہوا تھا اور جس کی وجہ سے مغربی دنیا کی توجہ عالم اسلام پر مرکوز ہوگئی۔ تاہم اسلام سے متعلق آگاہی کی اس نئی فضا کے باوجود یورپ کے اندر اور باہر بہت سے یورپی لوگ ہنوز اسلام کے بنیادی عقائد تک سے ناواقف ہیں۔ مغربی ذرائع ابلاغ مسلسل اپنے قارئین کے سامنے اسلام کی ایک بالکل سیدھی اور ایک یکطرفہ تصویر پیش کر رہے ہیں، جس سے بالعموم یہ تاثر ابھرتا ہے کہ عالم اسلام جنونیوں اور انتہا پسندوں سے بھرا ہوا ہے اور تمام مسلمان خواتین پردے میں محبوس اور محکومیت اور جبر کا شکار ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ گزشتہ سال فرانس کے بعض نواحی علاقوں میں بے اطمینانی کا شکار افریقی اور عرب نوجوانوں کی طرف سے کیے جانے والے فسادات کے بعد یورپی حکومتوں میں یورپ کی مسلم اقلیتوں کی بڑھتی ہوئی بے چینی کا ادراک بھی بہتر ہو رہا ہے۔ یہ اقلیتیں عام طور پر یورپی معاشرے میں غیر مساوی حیثیت کی حامل ہیں۔

یورپی یونین کے ذمہ دار حضرات کا کہنا ہے کہ اسلام کے حوالے سے درست اصطلاحات کی تلاش کی حالیہ کوشش ۲۵ ملکوں پر مشتمل یورپی بلاک میں داخلی طور پر جاری اس بحث و مباحثے کا ایک حصہ ہے، جس کا عنوان یہ ہے کہ مسلم ممالک کے ساتھ گہرے تعلقات کیسے استوار کیے جائیں اور یورپ میں مقیم ۲۰ ملین مسلمانوں کے ساتھ کیسے بہتر روابط قائم کیے جائیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس مقصد کے حصول کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ یہ بات واضح کر دی جائے کہ اہل یورپ اسلام اور دہشت گردی کو مترادف نہیں سمجھتے۔ تازہ گائیڈ لائنز میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت کے مابین، جو امن پسند ہے اور مرکزی دھارے سے کٹی ہوئی اس اقلیت کے مابین، جو اپنے مقاصد کے لیے غلط طور پر اسلام کا نام استعمال کر رہی ہے، واضح طور پر فرق ملحوظ رکھا جائے۔ یورپی یونین کے ایک عہدیدار کے بقول '' ہمارا مقصد اسلام کے حوالے سے یورپی یونین کے موقف کو واضح کرنا اور اس امر کو یقینی بنانا ہے کہ دہشت گردی کا رشتہ کسی مخصوص مذہب کے ساتھ نہ جوڑا جائے''۔ مذکورہ عہدیدار نے مزید کہا کہ حالیہ کوشش کا مقصد ''ایسے الفاظ کو فروغ دینا ہے، جن سے غلط فہمی پیدا نہ ہو اور خیالات کی غلط ترجمانی سے بچا جا سکے۔

یورپی یونین کے واقفانِ حال کا کہنا ہے کہ اس کوشش کے نتیجے میں ''اسلامی دہشت گردی'' اور ''بنیاد پرستی'' جیسی اصطلاحات کو ترک کر دیا جائے گا جنہیں ناقدین کے بقول یورپی یونین کے عہدیداران مسلم دنیا میں رہنے والے یا وہاں سے تعلق رکھنے والے انتہا پسندوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ ''عوامی سطح پر بیانات کے لیے مبینہ غیر جذباتی زبان'' کی رو سے عہدیداروں کو جہاد سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے بھی احتیاط برتنی ہوگی۔ اگرچہ اس وقت مسلم دنیا کی بعض انتہا پسند تنظیمیں اس لفظ کو ''غیر مسلموں کے خلاف جنگ'' کے مفہوم میں استعمال کرتی ہیں، تاہم بہت سے مسلمانوں کا کہنا ہے کہ اس کا مطلب ایک ''داخلی اور روحانی جدوجہد'' ہے۔ باخبر ذرائع کا کہنا ہے کہ مجوزہ نئی اصطلاحات کی پابندی لازم تو نہیں ہوگی لیکن جون میں برسلز میں ملاقات کے موقع پر یورپی بلاک کے قائدین اس کی تائید کر دیں گے۔

تاہم یورپی پارلیمنٹ کے برطانوی رکن سجاد کریم اور ان کے ہم خیال لوگوں کے نزدیک اسے کوئی فوری اقدام نہیں کہا جا سکتا۔ ان کا کہنا ہے کہ یورپی یونین کے عہدیداروں کو اسلام کا لبادہ اوڑھنے والے دہشت گرد گروہوں سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے زیادہ احتیاط کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ سجاد کریم کا کہنا ہے کہ ''اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یورپ میں لوگ مشرق وسطیٰ میں رونما ہونے والے تشدد کے بارے میں بات کرتے ہوئے اسلامی دہشت گردی کا لفظ استعمال کرتے ہیں''۔ حالانکہ فلسطین میں رونما ہونے والے واقعات کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کا باعث تو زیادہ تر فلسطینی عوام کی بے چینی اور اضطراب ہے۔ سجاد کریم کا اصرار ہے کہ ''گزشتہ سال فرانس کے مسلم نوجوانوں کا احتجاج بھی دراصل اس حقیقت کی عکاسی کر رہا تھا کہ یہ نوجوان یورپی معاشرے میں گھل مل نہیں سکے۔ اس سارے معاملے کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا''۔

یورپی یونین کے عہدیداران جن میں کمشنر برائے خارجہ تعلقات Benita ferrero-waldner اور سیکورٹی پولیس چیف Javier solana شامل ہیں، جہاں اس بات کا جائزہ

باقی صفحہ نمبر ۴

جمہوریت ''اکثریت کی آمریت''!

خورشید ندیم

جمہوریت اکثریت کی آمریت نہیں ہے۔ جو ایسا سمجھتا ہے اسے علمِ سیاسیات کے مبادیات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

جمہوریت کے ناقدین کی عمومی روش یہ ہے کہ وہ اس کے خلاف ایک مقدمہ قائم کرتے ہیں پھر اس خود ساختہ مقدمے کا اپنے تئیں رد کرتے ہیں، اس کے بعد فتح کے پھریرے لہراتے میدان میں نکل آتے اور جمہوریت کی شکست کا جشن مناتے ہیں۔ ایسا ہی ایک مقدمہ یہ ہے کہ ''جمہوریت اکثریت کی آمریت ہے'' یا یہ کہ جمہوریت اسلام کے خلاف ہے کیونکہ قرآن مجید کہتا ہے کہ ''اکثریت راستے سے بھٹکانے والی ہے'' یا پھر ''پاک اور ناپاک برابر نہیں ہوتے''۔ آج ایک نظر ان دونوں مقدمات پر ڈالتے ہیں۔

جمہوریت ایک سیاسی تصور اور سماجی رویہ ہے، جو انسان کی تکریم اور شرف کی اساس پر کھڑا ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ نظم اجتماعی کی تشکیل میں فرد کی رائے معتبر ہے۔ یہ تصور جب امرِ واقعہ بنتا ہے تو چند اجزا کی صورت میں متشکل ہوتا ہے۔ اس کا ایک جزو بالغ رائے دہی ہے۔ ایک پارلیمان ہے۔ ایک آئین ہے، جسے اہلِ علم عمرانی معاہدہ کہتے ہیں اور (General will) سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ بنیادی انسانی حقوق کا احترام جمہوریت کا حصہ ہے۔ کسی ایسے معاشرے کو جمہوری نہیں کہا جا سکتا، جس میں انسانی حقوق پامال ہوتے ہوں۔ جمہوریت میں تمام شہریوں کے بنیادی حقوق مساوی ہوتے ہیں۔ اس باب میں یہ تصور اکثریت اور اقلیت کے فرق کو قبول نہیں کرتا۔ دنیا میں اقلیتوں کے حقوق کی سب سے بڑی علم بردار جمہوری ریاستیں ہیں۔

امریکی انتخابات میں ایک اہم بات یہ سامنے آئی کہ ڈیموکریٹس کے خلاف جو فردِ جرم مرتب ہوئی، اس میں ایک جریمہ یہ بھی تھا کہ وہ اقلیتوں کے بارے میں زیادہ حساس ہیں۔ معروف امریکی دانش ور فوکویاما نے، ان انتخابات سے پہلے ''فارن افیئرز'' (جولائی، اگست ۲۰۱۶ء) میں امریکی سیاسی نظام کے زوال پر ایک مضمون لکھا تھا، جس میں ایک سروے کا ذکر کیا گیا، جو صدر ٹرمپ کے حامیوں سے لیے گئے انٹرویوز پر مشتمل ہے۔ اپریل میں کیے گئے Quinnipiac University کے اس سروے کے مطابق ٹرمپ کے ۸۰ فی صد حامیوں کو ایک شکایت یہ تھی کہ ڈیموکریٹس کی حکومت اقلیتوں کی حمایت میں بہت آگے تک چلی گئی ہے۔ ڈیموکریٹس اسی جمہوری عمل کا حصہ ہیں۔ ٹرمپ کے لیے یہ آسان نہیں کہ وہ ایک امریکی آئین کی مخالفت کرے، جو اب کالے گورے اور مرد و زن کی تمیز کو قبول نہیں کرتا۔ امریکا اس مرحلے سے گزر چکا۔ ٹرمپ کے لیے بھی ممکن نہیں کہ وہ تاریخ کے پہیے کو الٹا گھما سکیں۔

پاکستان کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے۔ اس کا آئین ایک پارلیمان کا منظور کردہ ہے جو پارلیمانی نظام کو ریاست کے بنیادی اصولوں میں شمار کرتا ہے۔ انہی اصولوں میں بنیادی انسانی حقوق اور آزادیوں کا تحفظ بھی شامل ہے۔ یہ آئین اکثریت نے بنایا۔ یہی نہیں، پاکستان مسلم اکثریتی تشخص کی بنیاد پر قائم ہونے والی ایک ریاست تھی لیکن اس کے باوجود، قائداعظم نے ۱۱/اگست ۱۹۴۷ء ہی کو یہ واضح کر دیا تھا کہ یہاں اکثریت کی آمریت نہیں قائم ہونے جا رہی ہے۔ اکثریت کسی فرد یا گروہ کے بنیادی حقوق سلب نہیں کر سکتی۔ یہ بات جمہوریت کے بنیادی اسباق میں شامل ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ پاکستان میں اقلیتوں کے حقوق کا جھنڈا انہی لوگوں نے اٹھا رکھا ہے، جو جمہوریت کے علم بردار ہیں۔ اس لیے اگر کوئی اسے اکثریت کی آمریت کہتا ہے تو یہ جمہوریت کے خلاف قائم ایک خود ساختہ مقدمہ ہے۔

اب آیے اس مقدمے کی طرف کہ قرآن مجید نے نظم اجتماعی کی تشکیل میں، اکثریت کو بطور بنیاد قبول نہیں کیا۔ یہ کہنا قرآن فہمی کا افسوسناک مظاہرہ ہے۔ اس حوالے سے جو آیات پیش کی جاتی ہیں، اس میں سے کسی ایک کا تعلق سیاسی نظام کی تشکیل سے نہیں ہے۔ قرآن مجید الہامی روایت کے تسلسل میں اپنا مقدمہ پیش کر رہا ہے کہ لوگوں کو مرنا اور ایک دن اپنے رب کے حضور میں پیش ہونا ہے۔ یہ مقدمہ اس لیے حق پر مبنی نہیں ہے کہ لوگوں کی اکثریت اس کو قبول کرتی ہے۔ یہ اس لیے حق ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان کیا گیا ہے۔ اسی کے تناظر میں سورہ انعام میں یہ فرمایا گیا کہ ''آپ اکثریت کی رائے پر چلیں گے تو یہ حق کے راستے سے بھٹکانے والے ہیں''۔ سورہ مائدہ میں پہلے یہ بیان ہوا کہ ''حالتِ احرام میں خشکی کا شکار منع ہے''۔ اس کے بعد بتایا گیا کہ ''اللہ تعالیٰ ہر بات سے باخبر ہے''۔ پھر یہ کہا گیا کہ ''ناپاک کی کثرت کتنی ہی فریفتہ کرنے والی ہو، پاک اور ناپاک برابر نہیں ہو سکتے''۔ ان آیات کا تعلق قرآن مجید کے بنیادی مقدمے سے ہے جو سارے انبیا پیش کرتے رہے ہیں۔ اس کا کسی نظمِ اجتماعی کی تشکیل سے کوئی تعلق نہیں۔

قرآن مجید اقوالِ زریں کا مجموعہ نہیں۔ یہ اللہ کی کتاب ہے جو حسنِ کلام کا شاہکار ہے۔ اس امت کا اجماع ہے کہ قرآن مجید کی موجودہ ترتیب توقیفی یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ نبی ﷺ نے وحی کی راہنمائی میں اس کو ترتیب دیا۔ اس کا ایک نظم ہے جو آیات میں ہے اور سورتوں میں بھی۔ اس کو نظر انداز کر کے آیات کی کوئی تفسیر نہیں کی جا سکتی، ورنہ نظمِ کلام کا تصور بے معنی ہو جائے گا۔ پھر تو اسے اسی صورت میں مرتب کر دینا چاہیے تھا، جس میں یہ نازل ہوا تھا۔ اس نظم کو سامنے رکھیں تو یہ ممکن نہیں کہ ان آیات کو جمہوریت یا کسی نظمِ اجتماعی سے متعلق کیا جائے۔

قرآن مجید نے ہمیں اس کتاب پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی امور میں ہم اس کی بات مانیں۔ اس نے مختلف آیات میں نکاح و طلاق سے لے کر سیاسی نظم تک، ہمیں ہدایات دی ہیں۔ جہاں جو بات کہی گئی ہے، سخن فہمی کا تقاضا ہے کہ وہاں سے وہی بات اخذ کی جائے۔ نظمِ اجتماعی کیسے تشکیل پائے گا، اس کے لیے اصولی راہنمائی سورہ شوریٰ میں دے دی گئی، ''ان کے معاملات باہمی مشاورت سے چلتے ہیں''۔ اس کا نام جمہوریت ہے۔ مکرر عرض ہے کہ جمہوریت حق و باطل کا فیصلہ نہیں کرتی، یہ فصلِ نزاع کرتی ہے۔ حکومتوں کے قیام کی اصل علت امن کا قیام اور بنیادی حقوق کا احترام ہے۔ تاریخ کی شہادت بھی یہی ہے کہ امن وہی حکومتیں قائم کر سکتی ہیں، جنہیں اکثریت کا اعتماد حاصل ہوتا ہے۔ یہ بات میں پہلے لکھ چکا کہ غلطی کا امکان جمہوریت سمیت ہر نظام میں موجود ہوتا ہے۔ جمہوریت کا فیضان یہ ہے کہ اس میں اصلاح کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ عوام چاہیں تو اپنا فیصلہ بدل سکتے ہیں۔

یہ عامیانہ مثال بھی دی جاتی ہے کہ جمہوریت میں سو بچوں کے قاتل جاوید اقبال اور ایک پرہیزگار آدمی کا ووٹ برابر ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ بیس کروڑ کی آبادی میں کتنے جاوید اقبال ہوتے ہیں؟ قانون اور اصول اکثریت کی بنیاد پر بنتے ہیں،

باقی صفحہ نمبر ۴

چیچنیا اور کریملن ایک راہ پر

(دوسری اور آخری قسط)

Vadim Dubnov

اس میں کوئی شک نہیں کہ رمضان قادروف اپنی اتھارٹی قائم کرنے میں بہت حد تک کامیاب رہا۔اس نے اندرونی سلامتی کی صورت حال بہتر بنانے کے حوالے سے اہم اقدامات کیے جو بارآور ثابت ہوئے۔ فوجی عملہ براہِ راست اسے رپورٹ کرنے کا پابند کیا گیا اور اس پابندی کا احترام بھی کیا گیا۔اس نے اشرافیہ سے بہتر تعلقات استوار کرنے میں بھی کامیابی حاصل کی۔ سیاست کے معاملے میں عوام کے بیشتر مطالبات نظر انداز کردیے گئے۔ ویسے لوگوں کے مطالبات کچھ زیادہ اور پیچیدہ نہ تھے۔وہ چاہتے تھے کہ پورے خطے میں کہیں بھی آزادانہ آ اور جاسکیں۔ وہ چاہتے تھے کہ فیڈرل چیک پوائنٹس ہٹادی جائیں، کیونکہ ان چیک پوائنٹس سے ان کی حرکت پذیری میں مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔رمضان قادروف نے عوام کو آزادانہ نقل وحرکت کی اجازت دی۔اسے اس کی بہت بڑی سیاسی کامیابی تصور کیا جاتا ہے۔

رمضان قادروف نے قوم پرستوں کے خلاف جانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ انہیں کمزور کرکے اس نے چیچنیا کو روسی فیڈریشن کا حصہ بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ جب رمضان قادروف کا اقتدار مضبوط ہوگیا اور اس نے اپنے فیصلوں پر سختی سے عمل کرانا شروع کیا تب چیچن باشندوں نے سوالات پوچھنا ترک کردیے۔روس سے بہتر تعلقات استوار کرنے اور کسی حد تک اُس میں انضمام کے حق میں سوچ دکھائی دینے لگی۔ رمضان قادروف کی توجہ اس نکتے پر مرکوز رہی کہ چیچنیا میں زندگی بسر کرنا دشوار نہ ہو اور معاملات اُسی طور خوش اسلوبی سے چلتے رہیں، جس طور داخلی خودمختاری سے متصف دیگر علاقوں میں رہے ہیں۔اس دوران روس نے چیچنیا کی معیشت کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کرنے پر رضامندی ظاہر کی اور ساتھ ہی ساتھ اس خطے سے الگ تھلگ رہنے پر بھی آمادہ ہوا۔ یہ گویا چیچنیا کو رشین فیڈریشن کا حصہ بنانے کی طرف واضح قدم تھا اور یوں چیچنیا میں کسی حد تک استحکام کی راہ ہموار ہوئی۔

شخصی سیاست

احمد قادروف کی موت سے روس اور آزاد خطوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت تبدیل ہوئی۔ رشین فیڈریشن چیچنیا، تاتارستان، داغستان وغیرہ کو طاقت سے دباتی آئی تھی اور اس کے نتیجے میں غیر معمولی حد تک خرابیاں بھی پیدا ہوئی تھیں مگر احمد قادروف کے بعد رشین فیڈریشن نے طاقت کے استعمال کو بہترین حل کی حیثیت سے قبول کرنے سے گریز شروع کیا۔ ماسکو نے گورنروں اور مقامی رہنماؤں کی ''رہنمائی اور معاونت'' کے لیے اپنے نمائندے بھیجنا ترک کیے۔ رمضان قادروف نے مقامی رہنماؤں اور کریملن کے درمیان بہتر تعلقاتِ کار کی راہ ہموار کی۔اس پورے عمل میں نظام کو زیادہ مضبوط بنانے کے بجائے شخصی قوت میں اضافے پر توجہ دی گئی۔ روسی لیڈر ولادیمیر پوٹن بھی تو یہی چاہتے تھے کہ اہم منصب پر فائز ہونے والوں کو غیر معمولی اختیارات حاصل رہیں۔چیچنیا اور دیگر علاقوں کے رہنماؤں کو ماسکو کے جونیئر پارٹنرز کا درجہ مل گیا۔ رشین فیڈریشن چاہتی تھی کہ ان کی مدد سے ان کے علاقوں کو بہتر انداز سے کنٹرول کیا جائے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رمضان قادروف پر ماسکو کا انحصار بڑھتا گیا۔چیچنیا کی بحالی میں رمضان قادروف کے چند اقدامات نے اہم کردار ادا کیا۔اس نے تعمیرات کے شعبے کو نئی زندگی دی۔ ماسکو نے اس معاملے میں بہت حد تک تماشائی کا کردار ادا کیا تاہم رمضان قادروف کی مدد کرنے سے گریز کی پالیسی بھی اختیار نہیں کی۔ ماسکو کے تعاون سے چیچنیا کے طول وعرض میں تعمیرات کا کام تیز کردیا گیا۔ایک مدت تک جاری رہنے والی لڑائی کے باعث کئی علاقے مکمل طور پر تباہ ہوچکے تھے۔ جب ماسکو نے بحالی کے کام میں معاونت پر رضامندی ظاہر کی تو چیچن عوام نے بھرپور دلچسپی کے ساتھ ماسکو کو خوش آمدید کہا۔ بہت سے دیہاتوں کی انتظامیہ کو قرضے دیے گئے تاکہ وہ بنیادی ڈھانچا تعمیر کرسکیں اور لوگوں کے لیے زندگی آسان بنائیں۔ ان قرضوں کی ادائیگی کو آسان بنانے کے لیے ماسکو نے امداد فراہم کی۔

چیچنیا میں امن برقرار رکھنے کے لیے رمضان قادروف کو ماسکو کی طرف سے آزادی دی گئی۔مخالفین کو گرفتار کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے مکانات منہدم کرنے پر بھی ماسکو نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ سارا زور اس نکتے پر تھا کہ پورے چیچنیا میں صرف امن دکھائی دینا چاہیے۔جب بنیادی ڈھانچا مضبوط ہوا اور شورش کے خلاف اقدامات نے زور پکڑا تب حکومتی ڈھانچا مستحکم تر ہوتا گیا۔۲۰۱۵ء کے اوائل میں یہ اندازہ لگایا گیا کہ پورے چیچنیا میں کم وبیش سات ہزار افراد نے حکام کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چیچنیا کی باضابطہ فورس تیار کرنے کے حوالے سے اقدامات بڑھتے گئے ہیں۔ بھرتی اور تربیت کا عمل تیز ہوا ہے، جس کے نتیجے میں نوجوان شورش کی طرف جاتے ہوئے کترانے لگے ہیں۔ طویل عرصے سے لڑتے لڑتے وہ بھی تنگ آچکے ہیں اور اب چاہتے ہیں کہ ریاستی ڈھانچے کا حصہ بنیں۔کل تک جو نجی فوج تھی وہ اب بہت حد تک سرکاری فورس میں تبدیل ہوچکی ہے۔اس فوج کے بہت سے یونٹس کو قانون نافذ کرنے والے ریاستی اداروں کا حصہ بنادیا گیا تاکہ خانہ جنگی کا گراف نیچے لانے میں مدد مل سکے۔ مختلف ناموں سے کام کرنے والے بہت سے یونٹس کو پولیس کا حصہ بنادیا گیا ہے تاکہ وہ ریاست بھر میں امن برقرار رکھنے میں کلیدی کردار ادا کرسکیں۔

نظریاتی سطح پر رونما ہونے والے خلا نے چیچنیا میں غیر معمولی تبدیلیوں کی راہ ہموار کی۔ سیکیورٹی فورسز کے نام پر لڑنے والے گروپوں میں شامل نوجوانوں کو کسی کاز کے لیے لڑنے سے زیادہ اس بات سے غرض تھی کہ انہیں ہتھیار آسانی سے میسر رہیں۔انہیں معلوم تھا کہ پورے چیچنیا میں ہتھیاروں کی بھرمار ہے اس لیے لازم ہے کہ اپنا تحفظ یقینی بنانے کے لیے زیادہ سے زیادہ ہتھیار حاصل کیے جائیں۔ بہت سے زیر زمین گروپ کام کررہے تھے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ ایک باضابطہ فورس تشکیل پارہی ہے تو ان میں بھی باہر آکر نارمل زندگی بسر کرنے کا شوق پیدا ہوا۔

اس دوران رمضان قادروف کی سربراہی میں کام کرنے والی اشرافیہ نے نوآبادیاتی دور کی بیوروکریسی کو ایک ایسے نظام سے تبدیل کیا، جو بہت حد تک انڈر ورلڈ کے طریق کار سے مناسبت رکھتا تھا۔ اس نظام میں سب کو کسی ایک فرد کے سامنے جوابدہ ہونا پڑتا تھا۔قانون کی حدوں سے باہر رہتے ہوئے کام کرنے پر بھی انہیں اپنے انتہائی مضبوط لیڈر کے ماتحت ہی رہنا پڑتا تھا۔

ایسا نہیں ہے کہ سب کچھ ہنسی خوشی ہی ہوتا رہا ہے۔آج بھی مخالفین سر ابھارتے رہتے ہیں۔رمضان قادروف سے اختلاف کرنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ تمام اختیارات کسی ایک فرد کے ہاتھ میں نہ رہیں۔اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ چیچنیا میں وہ تبدیلیاں رونما نہیں ہوئیں جو ہونی چاہئیں۔ جو لوگ اختلاف کرتے ہیں ان کا صفایا کردیا جاتا ہے۔رمضان قادروف کا قریبی ساتھی مولادی بیسا روف ۲۰۰۶ء میں ماسکو

میں مارا گیا تھا۔ ۲۰۰۷ء میں جب ماسکو نے سیکنڈ آپریشنل انوسٹی گیشن بیورو کے سربراہ کو اختیارات دینے سے انکار کیا تو رمضان قادروف کے لیے اسے تبدیل کرنا ناگزیر ہوگیا۔

ماسکو کو بظاہر اس بات سے کچھ غرض نہ تھی کہ چیچنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ کریملن میں بیٹھے ہوئے پالیسی ساز تو صرف یہ چاہتے تھے کہ چیچنیا میں رشین فیڈریشن کے لیے پائی جانے والی مخالفت ختم ہوجائے۔ اس مقصد کا حصول اگرچہ مشکل تھا مگر ایسا نہ تھا کہ بات بن ہی نہ سکتی تھی۔ جب رمضان قادروف نے بہت سے اقدامات کے ذریعے یہ ثابت کردیا کہ وہ رشین فیڈریشن سے اچھے تعلقات چاہتا ہے اور چیچنیا میں باغیانہ روش کو مکمل طور پر کچلنے کے موڈ میں ہے تو اسے پوٹن کے پیادے کی سی حیثیت حاصل ہوگئی اور یوں اس کے لیے ممکن ہوگیا کہ اپنی بات زیادہ کھل کر بیان کرسکے اور جو کچھ مانگنا ہے وہ بھی کھل کر مانگے۔ رفتہ رفتہ یہ بات بھی سامنے آنے لگی کہ رمضان قادروف اپنے اختیارات کا دائرہ وسیع تر کرنے کے موڈ میں ہے۔ یہ غیر محسوس عمل تھا۔

کرشمے پر کرشمہ

رمضان قادروف نے اپنے اثرات کا دائرہ بہت عمدگی سے وسیع کیا۔ ابتداء میں تو سلامتی کی صورت حال بہتر بنانے پر توجہ دی گئی۔ سڑکیں تعمیر کی گئیں، چیک پوائنٹس ختم کی گئیں اور لوگوں کو گھروں میں سکون سے سونے کا موقع فراہم کیا گیا۔ اس کے بعد بنیادی ڈھانچے کو بہتر بنانے کا عمل شروع ہوا۔ اسکول تعمیر کیے گئے۔ پارک بنائے گئے۔ نوجوانوں کو تعمیری سرگرمیوں کی طرف مائل کرنے کے لیے چیچنیا کے طول و عرض میں اسٹیڈیم تعمیر کیے گئے۔ یہ سب کچھ راتوں رات نہیں ہوا۔ ایک پوری نسل نے یہ سب کچھ ہوتے ہوئے دیکھا اور پھر ان کی نظر میں رمضان قادروف ہیرو ٹھہرا۔ والی بال اور فٹبال کی قومی ٹیمیں تشکیل دی گئیں۔ جو لوگ ایک عشرے سے زیادہ کی لڑائی سے تنگ آئے ہوئے تھے ان کے لیے یہ تبدیلیاں غیر معمولی اور مثبت تھیں۔ لوگوں کے گلے شکوے دور کرنے کے لیے سرکاری فنڈ کی مدد سے بہت سی سہولتوں کا اہتمام کیا گیا۔ تعلیم، صحت عامہ اور کھیلوں پر خاص توجہ دی گئی۔

ماسکو کو رمضان قادروف سے بہت کچھ درکار تھا اور وہ ملا بھی۔ اس کے بدلے ماسکو نے رمضان قادروف کو بہت کچھ دیا بھی مگر اس کا یہ مطلب نہیں لیا جاسکتا کہ ماسکو کے لیے وہ ناگزیر ہوگیا۔ ماسکو نے اپنے حقیقی اور بنیادی مفادات پر کبھی سودے بازی نہیں کی۔ چیچنیا کو جس حد تک آزادی، خود مختاری اور سہولتیں دی جاسکتی تھیں ضرور دی گئیں مگر ساتھ ہی ساتھ بہت سے معاملات میں بلیک میل ہونے سے صاف انکار کردیا گیا۔ رشین فیڈریشن نے گروزنی میں قائم کی جانے والی توانائی کی ایک بڑی فرم میں چیچنیا کو مرکزی اسٹیک ہولڈر بنانے سے صاف انکار کیا۔ یہ ایسا اقدام تھا جس سے رمضان قادروف کی شہرت داغ دار ہوئی۔ گروزنی کے لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ ماسکو سے اپنی ہر بات منوانے میں کامیاب ہوتا چلا جائے گا۔ ماسکو کے پالیسی سازوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کسے کس حد تک قبول اور برداشت کرنا ہے۔ انگوشیتیا اور داغستان میں رمضان قادروف کی شہرت داغ دار ہوئی تو ماسکو سے تعلقات تھوڑے سے کشیدہ ہوئے۔ توانائی کے اس بڑے منصوبے سے چیچنیا کو کچھ خاص مل نہیں سکا ہے۔ روس نے ٹیکسوں سے ہونے والی آمدنی کا بڑا حصہ بھی اپنے پاس رکھا ہے۔ اس حوالے سے چیچنیا میں عوامی سطح پر شدید جذبات پائے جاتے ہیں مگر ماسکو نے ان جذبات کی پروا نہیں کی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ماسکو نے چیچنیا کی سیاست اور معیشت دونوں کو مستحکم کرنے میں دلچسپی لی ہے، اہم کردار ادا کیا ہے۔ ماسکو سے ملنے والے فنڈز کی مدد سے رمضان قادروف نے معیشت کو مستحکم کرنے میں دلچسپی لی اور پھر اس کا کریڈٹ بھی لیا۔ اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ رشین فیڈریشن چیچنیا کی سیاست اور معیشت میں زیادہ مداخلت نہیں کرے گی۔ یہ سوچ غلط تھی۔ رشین فیڈریشن علاقائی سپر پاور ہے۔ وہ اگر کچھ دے رہی تھی تو لازمی طور پر اس کے بدلے کچھ چاہتی بھی تھی۔ یہ تو ممکن ہی نہ تھا کہ چیچنیا کو سب کچھ بلا معاوضہ دے دیا جاتا۔ اس دنیا میں "فری لنچ" نام کی کوئی چیز نہیں۔

واپسی کا سفر

ولادیمیر پوٹن نے ۲۰۱۲ء میں اقتدار کی تیسری مدت شروع کی تو بہت کچھ بہت تیزی سے تبدیل ہونے لگا۔ رمضان قادروف نے یہ سوچ لیا تھا کہ اب اس کے اقتدار کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ روس سے ملنے والی غیر معمولی امداد اور زراعانت کے ذریعے اس نے چیچنیا میں بنیادی ڈھانچا مضبوط بنایا اور لوگوں کو بنیادی سہولتیں فراہم کیں، جس سے اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا تاہم وہ یہ بات بھول گیا کہ اس کی کامیابی نے بہت سے دشمن بھی پیدا کیے ہیں۔ یہ دشمن کاکیشیا کے علاوہ روس میں بھی تھے۔ چیچنیا میں امن قائم کرنے کے لیے رمضان قادروف نے ایک طرف تو جنگجوؤں کو ختم کرنے کی پالیسی اپنائی اور ساتھ ہی ساتھ بہت سے جنگجوؤں کو داغستان اور انگوشیتیا میں پناہ لینے پر مجبور بھی کیا۔ چیچنیا کے مسلح جنگجو جب دیگر روسی ریاستوں میں گئے تو وہاں کے حکمران رمضان قادروف کے حوالے سے منفی جذبات کے حامل ہوئے۔ اس کے نتیجے میں رمضان قادروف کے دشمنوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ جن نوجوانوں کو چیچنیا کی حدود سے نکلنے پر مجبور کردیا گیا تھا، انہوں نے داغستان، تاتارستان اور انگوشیتیا میں منظم جرائم کے گروہوں سے مل کر رمضان قادروف کے خلاف لڑائی کی تیاری کی اور پھر لڑے بھی۔

رمضان قادروف کے لیے سب سے بڑے دشمن کا درجہ فیڈرل سیکیورٹی سروسز کو حاصل رہا۔ یہ سب کچھ رمضان کو اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا۔ رمضان قادروف کو اندازہ تھا کہ بہت سے معاملات میں اس کا ماسکو سے تصادم تو ہوگا۔ مفادات کا ٹکراؤ بہت سے دوسرے اختلافات کو ہوا دینے کا باعث بھی بنا۔ رشین فیڈریشن ہر بات سنتی آئی ہے اور جس قدر ضروری ہوا اتنی امداد بھی دیتی آئی ہے مگر وہ آزادی اور خود مختاری کے حوالے سے کچھ بھی سننے کے لیے تیار نہیں۔ رمضان قادروف کے ذہن میں یہ بات تھی کہ وہ کسی نہ کسی طور اندرونی خود مختاری حاصل کرکے عوام کی نظر میں ہیرو بن جائیں گے، مگر انہیں اندازہ نہ تھا کہ ماسکو کی طرف سے چیچنیا کو آزادی یا محدود خود مختاری کسی بھی طور میسر نہ ہوگی۔ ولادیمیر پوٹن کے لیے جب رمضان قادروف اور فیڈرل سیکیورٹی سروسز کے درمیان کسی ایک کو منتخب کرنے کا وقت آیا تب انہوں نے رمضان قادروف کو منتخب کیا۔ اس کے نتیجے میں فیڈرل سیکیورٹی سروسز کی نظر میں رمضان قادروف نے ناپسندیدہ شخصیت کا درجہ پایا۔

ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ رمضان قادروف نے روسی حکومت اور کاروباری طبقے کی طرف سے چیچنیا کی معیشت مضبوط کرنے کے اقدامات کے تمام فوائد اپنے منظور نظر افراد کو دیے۔ روس کے بڑے کاروباری اداروں کو بھی اس بات پر اعتراض تھا کہ رمضان قادروف نے اپنے پسندیدہ افراد کو چن چن کر ٹھیکے اور عہدے دیے ہیں۔ روس کے اعلیٰ حکام اور کاروباری شخصیات یہ بے ڈھنگی صورت حال برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ چیچنیا پر پیسہ لگایا ضرور جارہا ہے مگر اس کے حقیقی فوائد عوام تک نہیں پہنچ پارہے۔ رمضان قادروف نے تمام کاروباری فوائد اپنے منظور نظر افراد تک محدود رکھ کر ثابت کیا کہ وہ تمام اختیارات کے ساتھ ساتھ ریاست کو ملنے والے تمام فوائد بھی اپنے حلقے تک ہی محدود رکھنا چاہتا ہے۔ یہ صورت حال مجموعی طور پر چیچنیا کے خلاف تھی۔ چیچنیا کے طول و عرض میں ایسے اقدامات کی ضرورت تھی، جن کی مدد سے لوگوں کا معیار زندگی بلند ہوتا۔ لوگوں کو چند بنیادی سہولتیں فراہم کرنے کو بہت کچھ تصور کرلیا گیا۔

جب رمضان قادروف نے بھرپور معاونت کے باوجود ڈلیور کرنا مناسب نہ جانا تب ماسکو کی جانب سے فنڈ رو کے جانے لگے۔ اختیارات گھٹانے کا عمل بھی شروع ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ماسکو اور گروزنی کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہونے لگی۔ ماسکو جو کچھ چاہتا تھا وہ کرنے کے لیے گروزنی تیار نہ تھا۔ بہت سے قانونی امور میں بھی روس اور چیچنیا کے مابین بات بگڑتی چلی گئی۔

چیچنیا میں اسلام

عوام میں اپنی جڑیں گہری اور مضبوط رکھنے کے لیے رمضان قادروف نے ''انقلابی اسلام'' کے مقابل ''سیاسی اسلام'' کو آگے بڑھایا۔ ۲۰۱۲ء میں بی بی سی سے ایک انٹرویو میں رمضان قادروف نے کہا کہ ہم اسلام کی وہی تعبیر و تشریح قبول کرتے ہیں، جو روایتی طور پر چلی آ رہی ہے۔ ہم ایسی کسی بھی تشریح کو زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نہ پائی جاتی ہو۔ چیچنیا میں صوفی ازم کو ہر دور میں غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ایسے میں سیاسی اسلام کو ان لوگوں کے مقابل لانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آسکتی تھی جو انقلابی اسلام پر یقین رکھتے ہیں۔ رمضان قادروف نے ساتھ ہی ساتھ اسلامی شریعت کے متعدد اصولوں کو قوانین کا حصہ بنانے کا بھی عندیہ دیا۔

اسلام کی بات کر کے رمضان قادروف نے اپنی مقبولیت کو برقرار رکھنے میں کسی حد تک کامیابی حاصل کی۔ چیچنیا کے لوگوں نے اسلام خاصی تاخیر سے قبول کیا۔ داغستان اور دیگر خطوں کا معاملہ مختلف ہے۔ یہی سبب ہے کہ اسلام سے متعلق نظریات کی تشکیل و ترویج میں داغستان وغیرہ کا کردار بہت اہم ہے۔

اسلام کو ثقافت اور قوانین کا حصہ بنانے کی بات کر کے رمضان قادروف نے بہت سے معاملات کو اپنے حق میں کرنے کی کوشش کی۔ وہ چاہتا تھا کہ اسلامائزیشن کا عمل جاری رہے تاکہ اس کی حکومت کے ہاتھ مضبوط رہیں۔ بہت سے مخالفین نے رمضان قادروف پر الزام لگایا کہ وہ اسلام کا سہارا لے کر اپنا اقتدار مضبوط کرنا چاہتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ وہ رشین فیڈریشن کو ایک بار پھر اسلام سے متصادم کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ اس دعوے یا الزام میں زیادہ دم نہیں۔ رمضان قادروف خود انقلابی نہیں تھا اور وہ اسلام کے معاملے میں ویسا شدت پسند بھی نہیں تھا، جیسے دوسرے بہت سے لوگ تھے۔ کریملن کے پالیسی ساز اچھی طرح جانتے تھے کہ رمضان قادروف اسلام کو صرف اقتدار مستحکم کرنے کے لیے بروئے کار لا رہا ہے۔

جب رمضان قادروف نے ماسکو سے کچھ زیادہ مانگا یا استحقاق سے بڑھ کر نوازے جانے کی فرمائش کی تو معاملات بگڑنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چیچنیا کو، جو رشین فیڈریشن کے پسندیدہ خطوں میں تھا، ایک بار پھر ایسے علاقے کا درجہ دے دیا گیا جو ماسکو کے لیے زیادہ پسندیدہ یا قابل ترجیح نہیں۔ کریملن کے پالیسی ساز جانتے تھے کہ چیچنیا ان کے لیے کس حد تک کام کا ہے اور کس حد تک نہیں۔ یہی سبب ہے کہ جب رمضان قادروف نے اپنی منطقی حد سے آگے بڑھ کر کچھ حاصل کرنے کی کوشش کی تو معاملات اور تعلقات میں گرم جوشی نہ رہی۔ رمضان قادروف اپنا اقتدار ہر حال میں مستحکم رکھنا چاہتا تھا۔ ۲۰۱۳ء تک معاملات اتنے بگڑ گئے کہ پوٹن نے رمضان قادروف سے ٹیلی فون پر بات کرنا بھی گوارا نہ کیا۔ رمضان قادروف پر مخالفین کو قتل کرنے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں سے بگاڑ مول لینے کا الزام عائد کیا جانے لگا۔ وہ اپنے اقتدار کو ہر قیمت پر طول دینا چاہتا تھا۔ اس کے لیے وہ کوئی بھی حربہ آزمانے کو تیار تھا۔

کریملن سے گروزنی کے معاملات بگڑے تو روس کے متعلق وزراء نے رمضان قادروف کے ''اوصافِ خبیثہ'' گنوانا شروع کیے۔ داغستان اور انگوشیتیا کو اس سے جو بھی شکایت تھی، وہ کھل کر سامنے لائی گئی۔ ماسکو چاہتا تھا کہ رمضان قادروف کے خلاف کیس غیر معمولی حد تک مضبوط ہو تاکہ جب اس سے گلوخلاصی تک نوبت پہنچے تو کسی کو یہ محسوس نہ ہو کہ کہیں کوئی ناانصافی کی گئی ہے۔ ماسکو نے جب علاقائی رہنماؤں کو گرفتار کرنے کا عمل شروع کیا تو حقیقی تبدیلی کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ۲۰۱۳ء میں داغستان کے دارالحکومت کے میئر اور بڑے پاور بروکر کی گرفتاری نے علاقائی اشرافیہ کو ہلا کر رکھ دیا۔ خدشات پھر سر اٹھانے لگے۔ ۲۷ فروری ۲۰۱۵ء کو روس میں اپوزیشن کے ایک رہنما بورس نمستوف کے قتل میں چیچن جانبازوں کے ملوث ہونے کی اطلاعات نے ماسکو اور گروزنی کے تعلقات کو مزید نقصان سے دوچار کیا۔ اس کے بعد ماسکو نے قتل کی تفتیش میں چیچن جانبازوں کو باضابطہ فوکس کرنا شروع کیا۔

چھوٹے کردار کے ساتھ

رمضان قادروف نے بہت سے معاملات میں سمجھوتہ کر لیا ہے۔ اس کی قیادت کا انداز اگرچہ زیادہ تبدیل نہیں ہوا، مگر ماسکو کی بہت سی شرائط اس نے خاموشی سے مان لی ہیں۔ وہ بہت سے معاملات میں اپنی مرضی منوانے کی راہ پر گامزن نہیں۔ کوشش یہ ہے کہ کسی نہ کسی طور اقتدار برقرار رکھا جائے۔ مخالفین کو کچلنے کی پالیسی برقرار ہے۔ اس نے اپنے لیے ایک گھٹا ہوا کردار قبول کر لیا ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ماسکو سے رمضان قادروف کو کچھ ملے تو ملے، گروزنی کو اب کچھ زیادہ نہ مل سکے گا۔ رمضان قادروف نے طے کر لیا ہے کہ اختیارات اس کی ذات تک محدود رہیں اور کسی نہ کسی طور اقتدار کی گاڑی چلتی رہے تو بس ٹھیک ہے۔ چیچن عوام کے لیے یہ فائدے کا سودا نہیں ہے تو نہ سہی۔ وہ اب جو کچھ بھی کر رہا ہے اس سے ماسکو زیادہ متاثر ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ رمضان قادروف نے پوٹن کے قریبی حلقے میں داخل ہونے یا اس کی نظر میں پسندیدہ قرار پانے میں بھی کامیابی حاصل نہیں کی ہے۔ اب ان کا پوٹن سے براہِ راست رابطہ بھی نہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رمضان قادروف نے اپنا اقتدار کس قیمت پر برقرار رکھا ہے۔

رمضان قادروف نے چیچنیا میں علیحدگی پسند رجحانات کا خاتمہ کیا ہے۔ یہ بات روس کے لیے غیر معمولی حد تک اہم اور قابل قبول ہے اور اسی کے عوض رمضان قادروف کو اب تک برداشت بھی کیا جا رہا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ کب تک چلتا رہے گا۔ اگر چیچنیا کے عوام کو روس سے بہتر تعلقات کا ثمر نہ ملا تو کیا وہ رمضان قادروف اور رشین فیڈریشن دونوں کو اپنا سمجھتے رہیں گے؟ بنیادی مسائل حل نہ ہونے کی صورت میں چیچن عوام ایک بار پھر کبیدہ خاطر ہوں گے اور اس کے نتیجے میں ایک بار پھر باغیانہ روش پر گامزن ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

جدید چیچنیا جنگ زدہ خطہ نہیں، یہ نارمل ہو چکا ہے۔ اب عوام چاہتے ہیں کہ ان کے بنیادی مسائل حل ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ رمضان قادروف اب راہنما یا علامت کی حیثیت سے اپنی چارم کھو چکا ہے۔ لوگوں کو اس پر زیادہ بھروسہ نہیں رہا۔ ایسے میں سوچا جا سکتا ہے کہ چیچنیا میں بہت جلد کس طرح کے جذبات سر اٹھا سکتے ہیں۔

رمضان قادروف نے ماسکو سے اپنے اقتدار کے حوالے سے جو تازہ معاہدہ کیا ہے، وہ خطے کی قیادت کے چیچن دعوے کے لیے موت ثابت ہوگا۔ گھٹائے ہوئے اختیارات کے ساتھ رمضان قادروف کا چیچن کے معاملات پر متصرف ہونا عوام کے لیے کسی بھی کام کا نہیں یہ خالص ذاتی نوعیت کا معاہدہ ہے، جس میں چیچنیا اور اس میں بسنے والوں کے لیے کچھ بھی نہیں۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Chechnya's new contract with the Kremlin". ("carnegie.ru". October 27, 2016)

●●●

مستقبل کی افغان ریاست اور طالبان

یہ رپورٹ سینٹر آن انٹرنیشنل کوآپریشن (CIC) کی تیار شدہ ہے۔ CIC نیویارک یونیورسٹی کے شعبۂ سماجی اور سائنسی علوم کے تحت قائم تحقیقی مرکز ہے۔ CIC کی ویب گاہ کے مطابق اس کا بنیادی مقصد عالمی تناز عات اور مسائل میں بین الاقوامی تعاون اور اشتراکِ عمل کو فروغ دینا ہے۔ CIC آسٹریلیا، برازیل، انڈیا، چائنا، قطر، دبئی، امریکا اور یورپ سمیت دنیا بھر کے تحقیقی مراکز اور مجلسِ دانش وراں (Think Tank) سے قریبی تعلقات رکھتی ہے۔

افغانستان میں مستقبل کے ریاستی ڈھانچے کے بارے میں طالبان کے سرکردہ ارکان اور رہنماؤں کے خیالات جاننے سے متعلق اس رپورٹ کے مصنفین بنیادی خیال کے لیے ایڈمنڈ ہیلے کے اور تعاون کے لیے فارن ایڈ کامن ویلتھ آفس (یوکے) کے شکر گزار ہیں۔ نیویارک یونیورسٹی کے سینٹر آن انٹرنیشنل کوآپریشن کا دی افغانستان پاکستان ریجنل پروگرام حکومتِ ناروے کا بھی خاص طور پر احسان مند ہے کیونکہ اس کے تعاون کے بغیر اس رپورٹ کی اشاعت ممکن نہ ہوتی۔ اس رپورٹ میں دیپالی مکھوپادھیائے کی آراء سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

تعارف

(اس تعارف کے مصنف بارنیٹ آر ریوبن نیویارک یونیورسٹی کے سینٹر آن انٹرنیشنل کوآپریشن کے ایسوسی ایٹ ڈائریکٹر اور سربراہ ہیں۔)

اس بات کا سمجھنا مشکل نہیں کہ جو لوگ آپ کو قتل کرنے کے درپے ہوں ان کے افکار و اعمال کا متوازن تجزیہ کرنا بہت دشوار ثابت ہوا کرتا ہے۔ افغانستان میں حکومت اور امریکی افواج سے جُڑے ہوئے لوگ، جنہیں یومیہ بنیاد پر شدت پسندانہ اور القاعدہ قسم کے ہتھکنڈوں کا سامنا رہتا ہے، کہتے ہیں کہ طالبان جنگ کرنے کے معاملے میں سخت تر شرائط رکھنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اگر طالبان نمائندہ جمہوریت کو ختم کر کے ۱۹۹۶ء تا ۲۰۰۱ء افغانستان میں پایا جانے والا ریاستی ڈھانچا ہی بحال کرنا چاہتے ہیں اور وہی پالیسیاں اپنانا چاہتے ہیں جن سے افغانستان کے لیے ترقی کے معکوس کا در کھلا تھا تو کہنا پڑے گا کہ وہ کسی بھی طور افغانستان کے بحران کا سیاسی حل تلاش کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔

طالبان کے سیاسی دھڑے سے تعلق رکھنے والی سرکردہ شخصیات، ڈیڑھ عشرے کے دوران طالبان کی طرف سے جاری کردہ مطبوعات اور کسی بھی صورت حال سے متعلق باضابطہ بیانات کے تجزیے کے بعد گوپال اور برہان عثمان مختلف نتائج تک پہنچے ہیں۔ ایسے طالبان کم ہیں جو ۱۹۹۶ء سے ۲۰۰۱ء تک کے زمانے کو دہرانے کے حق میں ہیں۔ ان کا بنیادی شکوہ یہ ہے کہ انہیں ناکردہ جرم (نائن الیون) کی سزا دینے کے لیے ان کی سرزمین پر امریکی فوج اتری ہوئی ہے۔ افغانستان کے موجودہ غیر اسلامی آئین کے لیے بھی وہ ان حالات ہی کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ امریکا نے افغانستان کی سرزمین پر قدم جما رکھے ہیں اور طالبان یا ان کے ہم خیال افراد کو کچلنے کے لیے سرگرم ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سابق سوویت یونین کی افواج کے انخلاء کے بعد افغانستان میں جو انتشار، جرم پسندی اور تقسیم پیدا ہوئی تھی وہ اب نہیں رہی۔ ایسے میں طالبان کے پاس لڑنے کے لیے صرف ایک جواز رہ جاتا ہے..... افغان سرزمین پر غیر ملکی افواج کی تعیناتی۔

طالبان اور موجودہ نظام کے حامی افغان حکام ٹریک ٹو نوعیت کی گفت و شنید میں مصروف رہے ہیں۔ ملک کو چلانے کے معاملے میں تو فریقین میں حیرت انگیز حد تک اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ پہلے میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ افغان تنازع کا کوئی حل تلاش کرنا اتنا مشکل نہ ہوگا جتنا ہم سمجھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ طالبان اور دیگر افغانوں کے درمیان نظریاتی فرق بھی ہے مگر اصل مسئلہ یہ ہے کہ غیر ملکی افواج کا کس طرح مکمل انخلا کیا جائے۔ اس وقت امریکی پالیسی سازوں نے اس نکتے پر توجہ مرکوز کر رکھی ہے کہ افغانستان میں ایک گروپ کو شکست دینے اور تباہی سے دوچار کرنے کے لیے دوسرے گروپ کو مستحکم کیا جائے۔ یہی سبب ہے کہ طالبان کو القاعدہ اور اس کے ہم خیال گروپ امداد فراہم کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ اپنے طے کردہ اہداف کے حصول کے لیے متحرک رہیں۔

جن طالبان سے مصنفین نے بات کی انہوں نے تسلیم کیا کہ ان کے اور میدان میں غیر ملکی افواج یا افغان فورسز سے لڑنے والوں کے خیالات میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ جن لوگوں کا غیر معمولی جانی نقصان ہوا ہے وہ چاہتے ہیں کہ انتقام لیں یا پھر مذاکرات کی صورت میں ان کے نقصان کی تلافی کی جائے۔ جو لوگ اب تک میدان میں ہیں یعنی افغان فورسز اور غیر ملکی افواج سے لڑ رہے ہیں ان کے جذبات کو سمجھنا اور انہیں قابو میں رکھنا طالبان کی مرکزی قیادت کا فریضہ ہے۔ ایسا بھی ہو چکا ہے کہ قیادت نے کوئی ہدایت جاری کی مگر کسی مقام پر جان کی بازی لگا کر دشمنوں کو پیچھے ہٹانے اور ایک وسیع علاقے پر قبضہ کرنے والے طالبان نے لوٹ مار بھی کی اور دشمنوں سے انتقام بھی لیا۔ ستمبر ۲۰۱۵ء میں قندوز میں ایسا ہی ہوا تھا۔

ملا عمر کے انتقال اور ملا اختر محمد منصور کی ہلاکت سے طالبان پر مرتب ہونے والے اثرات کا اندازہ لگانا ابھی قبل از وقت ہوگا۔ طالبان کے سیاسی دفتر نے طیب آغا کی قیادت میں جنگ سے نکلنے کا راستہ تلاش کرنے کے لیے بات چیت شروع کی تھی۔ یہ بات سب پر عیاں تھی کہ طیب آغا ملا عمر کے نمائندے کا سا مقام رکھتے تھے۔ یہ معلوم ہونے پر پاکستان کی حکومت اور طالبان نے ملا عمر کی موت کو دو سال تک چھپائے رکھا، طیب آغا نے استعفیٰ دے دیا۔ کم ہی لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ طالبان کی مرکزی قیادت اور طالبان کے سیاسی دفتر کے درمیان اس وقت کس نوعیت کا تعلق ہے۔

پاکستان نے ۲۰۰۱ء کے بعد افغانستان میں ابھرنے والی مجموعی صورت حال کو اپنے لیے شدید خطرہ تصور کیا اور یوں افغان بحران کو کنٹرول کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔ پاکستان اگر افغانستان میں زیادہ ملوث نہ ہوا ہوتا تو آج صورت حال بہت مختلف ہوتی۔ امریکا اور افغان صدر اشرف غنی پاکستان سے بات چیت کرنے کے لیے تیار ہیں۔ وہ پاکستان کے مفادات کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کے تحفظات دور کرنے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ مگر تجزیہ کار کہتے ہیں کہ طالبان کچھ زیادہ مانگ رہے ہیں۔

مسلح جدوجہد یا شورش دنیا کے ہر خطے میں ہوتی رہی ہے۔ جیسا دوسرے مقامات پر ہوتا ہے ویسا ہی افغانستان میں بھی ہوا۔ طالبان نے بھی منشیات، اسمگلنگ اور قدرتی وسائل کی بندر بانٹ کے ذریعے اپنے مالیاتی ذرائع مستحکم کر لیے۔ ایک دور تھا کہ طالبان کی فنڈنگ کے لیے غیر قانونی ذرائع سے بھی رقوم کا بندوبست کیا جاتا تھا مگر وہ دور گیا۔ اب فنڈنگ ہی سب کچھ ہے۔

غیر ملکی افواج کے انخلاء کے حوالے سے اختلافات نے اب تک افغانستان کی سیاسی قیادت اور طالبان کی جان نہیں چھوڑی۔ ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ افغان حکومت کے نمائندے اور طالبان ملک کے مستقبل پر بات چیت کے لیے تیار ہیں۔ طالبان کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وہ غیر ملکی افواج کے انخلا تک بات چیت کے لیے تیار نہیں۔ دوسری طرف افغانستان کی وہ سیاسی جماعتیں اور شخصیات طالبان کی واپسی کے لیے تیار نہیں جو اپنے تحفظ کے لیے بیرونی افواج کو ناگزیر سمجھتی ہیں۔ ان کا زور اس بات پر ہے کہ پہلے کوئی سیاسی تصفیہ کر لیا جائے۔ اس کے بعد غیر ملکی افواج کو بھی نکال باہر کیا جائے گا۔

صحافی جیفرے گولڈ برگ نے کئی انٹرویوز کے بعد امریکا کے صدر براک اوباما کے حوالے سے کہا ہے کہ انہیں بھی وہی بیماری لاحق ہے جو دوسرے بہت سے سیاست دانوں کو لاحق رہی ہے ..... یہ کہ امریکا انتہائی منفرد ملک ہے اور یہ کہ باقی دنیا امریکیوں کی شدید دشمن ہے۔ امریکی پالیسی میکرز کا یہ بھی کہنا ہے کہ اسلامی انتہا پسندی سمیت ہر طرح کی انتہا پسندی امریکا کے خلاف ہے۔ امریکا میں یہ تاثر عام ہے یا پروان چڑھایا گیا ہے کہ افغانستان میں جاری جنگ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا سوچنا ہماری سادہ لوحی کہلائے گا۔ افغانستان میں جنگ اسی وقت ختم ہوگی جب ہم ایسا کرنا چاہیں گے۔ (---جاری ہے!)

●●●

شام ''پراکسی جنگ'' کا میدان

کبھی نہ کبھی تو شام کی خانہ جنگی، جواب چھٹے سال میں داخل ہو چکی ہے، کا اختتام ہوگا۔ مگر کیسے؟ جیسے ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگوں کے دوران ایک دفعہ اسرائیلی وزیرِ خارجہ ابا ایبن نے کہا تھا کہ ''تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ افراد اور اقوام تب عقلمندانہ روش اختیار کرتے ہیں، جب وہ باقی تمام متبادل راستوں کو استعمال کر چکے ہوتے ہیں''۔

افسوس کی بات ہے کہ شام کے المیے میں ملوث کردار ابھی اس نہج کو نہیں پہنچے۔ ایران اور روس سے مدد کی بدولت اب بشارالاسد کی حکومت کو انہدام کا کوئی خطرہ نہیں۔ جبکہ سعودی عرب اور دوسری خلیجی ریاستوں کی حمایت کی وجہ سے بشار کے متفرق مخالفین بڑے خطوں پر اب بھی قابض ہیں۔ اور اگرچہ داعش، جو نہ صرف بشار الاسد بلکہ تمام حکومتوں کی دشمن ہے، کمزور تر ہونے کے باوجود طاقتور ہے، اور یورپ اور امریکا دونوں میں دہشت گرد حملے کرنے کی خوفناک اہلیت کا اظہار کر رہی ہے۔

سیاسی اور سفارتی ڈیڈلاک سے واضح ہوتا ہے کہ اس کا فوجی حل بھی آسان نہیں ہوگا۔ جنیوا میں ہونے والے مذاکرات صرف وقت کا ضیاع ثابت ہوئے۔ ستمبر میں امریکا اور روس کے درمیان صبر آزما بات چیت کے بعد طے پانے والی جنگ بندی کا اختتام خوفناک خون ریزی پر ہوا۔ ۱۹ ستمبر کو اقوامِ متحدہ کا ایک انسان دوست قافلہ حملے کا شکار ہو کر تباہ ہوا۔ امریکی الزامات کے مطابق یہ روسی یا شامی جہازوں کی کارروائی تھی، جبکہ روسی دعوے کے مطابق باغیوں کے زمینی حملے کی۔

اگلے دن اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل بان کی مون نے نیویارک میں جنرل اسمبلی کے اجلاس میں تمام لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے خطاب میں کہا کہ 'آج اس ایوان میں ان حکومتوں کے نمائندے بھی موجود ہیں جنہوں نے شامی تنازع میں شامی عوام کے خلاف ہر طرف سے ہونے والے مظالم کو نظر انداز کیا ہے، یا ان مظالم میں حصہ لیا ہے، مدد دی ہے، فنڈ دیے ہیں اور ان کے منصوبے بنائے ہیں۔

بیرونی قوتیں

بان کی مون نے جو حقیقت بیان کی وہ ''پروجیکٹ سنڈیکیٹ'' کے تجزیہ نگاروں کے تجزیوں کو صحیح ثابت کرتی ہے۔ ۲۰۱۱ء سے، جب بشارالاسد کی حکومت کے خلاف عوامی مظاہرے شروع ہوئے تھے، امریکا شام میں حکومت کی تبدیلی پر مصر ہے۔ روس، جس نے ستمبر ۲۰۱۵ء میں بشارالاسد مخالف قوتوں پر فضائی کارروائیاں شروع کیں، پُرعزم ہے کہ وہ بشارالاسد کی حکومت کو گرنے نہیں دے گا۔ اور شام مشرقِ وسطیٰ کے دو مرکزی حریفوں ایران اور سعودی عرب کے درمیان ''پراکسی'' جنگ کا میدان بنا ہوا ہے۔

ناقدین کا خیال ہے کہ اگر امریکی صدر اوباما نے تنازع کے آغاز میں ہی زیادہ قوت سے کام لیا ہوتا تو شام کی حکومت جلد ہی اعتدال پسند ''فری سیرین آرمی'' کے ہاتھوں میں آجاتی۔ البتہ اب ایف ایس اے ''کنارے'' لگ چکی ہے اور اسلامی انتہا پسند اسد کے مرکزی مخالفین ہیں۔ تجزیہ نگاروں کے مطابق جولائی تک جبہۃ الشام، جو مبینہ طور پر سب سے بااثر مخالف گروہ ہے، اور جو خود کو جبہۃ النصرہ کہتا تھا اور شام میں القاعدہ کا حصہ تھا کے لیے نام کی تبدیلی سے خلیجی ممالک (اور روسی دعوے کے مطابق امریکا سے بھی) ہتھیار اور پیسہ لینا بظاہر آسان ہو گیا ہے۔

لیکن کرسٹوفر آر ہل، جو عراق میں امریکا کے سفیر رہے ہیں، اس نظریے سے اتفاق نہیں کرتے کہ اوباما کا ردِعمل بہت محتاط تھا۔ ان کا خیال ہے کہ ''مداخلت پسندی جو لبرل اور نیوکنزرویٹوز دونوں ہی کی طرف سے تجویز کی جا رہی ہے، ایک دفعہ سے زائد بار تباہ کن ثابت ہوئی ہے، جس میں عراق اور لیبیا شامل ہیں۔

یہ بات درست ہے مگر ہل نے اس سے زیادہ دلچسپ نکتہ اٹھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بہت سے علاقائی کرداروں (بشمول اردن کے بادشاہ عبداللہ) کا خیال تھا کہ ۲۰۱۱ء کی 'عرب بہار' کے نتیجے میں اسد کی حکومت کا خاتمہ بس کچھ دیر کی بات تھی اور اس طرح ایک عبوری حکومت اور جمہوری انتخابات یقینی امر تھے۔ ہل کہتے ہیں کہ یہ تجزیہ غلط تھا اور چونکہ اچھے تجزیے کے بغیر اچھی حکمت عملی بھی نہیں بنائی جا سکتی۔

ہل کہتے ہیں کہ خاص طور پر یہ مفروضہ کہ بشارالاسد کنارے لگ چکے ہیں اور مایوسی کی حالت میں تاریخ کی بے رحم لہر کو محض دھکیلنے کی کوشش کر رہے ہیں، اوباما انتظامیہ کو مخالف قوتوں میں موجود سنی انتہا پسندوں کو کمتر سمجھنے پر مجبور کرتا گیا۔ حزبِ مخالف کا غلط اندازہ لگانے کے علاوہ اس یقین نے کہ اسد کی حکومت بس گرا ہی چاہتی ہے امریکی حکومت کو ایک اور غلطی کرنے پر مجبور کیا اور وہ غلطی دوسری طاقتوں کے مفادات کو پیشِ نظر نہ رکھنا تھی۔ اس کا ایک نتیجہ روس کی مداخلت تھی، جس کا طارطوس اور لاتاکیہ میں اپنے عسکری اڈوں کی حفاظت اور روسی اتحاد کے اندر اسلامی بغاوت کے حوالے سے پریشان ہونا قابلِ فہم تھا۔

یہ بات یقینی ہے، جیسا کہ اسرائیل کے سابق وزیرِ خارجہ شلومو بن آمی نے بھی کہا ہے، کہ اوباما کے لیے مشرقِ وسطیٰ میں بالعموم اور شام میں بالخصوص مداخلت سے دور رہنے کی مرکزی وجہ ان غلطیوں کے دہرائے جانے کا خوف تھا جس نے امریکا کو افغانستان اور عراق میں پھنسا کے رکھ دیا۔ لیکن کیا ضروری ہے کہ اس دفعہ بھی ایسا ہی ہوتا؟ بن آمی ان لوگوں کی نفی کرتے ہیں جن کے خیال میں روس کی مداخلت اسے ۱۹۸۰ء کی دہائی کے افغانستان جیسے دلدل میں پھنسا دے گی۔ وہ لکھتے ہیں کہ پوٹن نے ثابت کیا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں مداخلت کوئی دلدل ثابت نہیں ہوگی۔ اس کے برخلاف، یہاں تک کہ اگر سیاسی سمجھوتہ نہیں بھی ہوتا تب بھی پوٹن کی تزویراتی کامیابیاں نمایاں ہیں۔ عسکری مداخلت نے نہ صرف بشارالاسد کی حکومت کو گرنے سے بچایا بلکہ روس کے طارطوس اور لاتاکیہ اڈوں کو بھی تحفظ فراہم کیا جو مشرقی بحرِ روم میں امریکا اور نیٹو کو چیلنج کرنے میں اس کی مدد کریں گے۔

تُرک اور کُرد

امریکا اور روس کئی مہینوں سے اس بات کو یقینی بنائے ہوئے ہیں کہ ان کی فضائی افواج داعش اور دیگر انتہا پسند اسلامی گروہوں پر حملوں کے دوران ایک دوسرے سے نہ ٹکرائیں۔ اس سال فروری اور ستمبر میں وہ جنگ بندی کرنے میں بھی کامیاب ہوئے اگرچہ دونوں دفعہ وہ زیادہ دیر نہیں چلی۔

دیرپا امن معاہدہ تو ایک طرف، جنگ بندی قائم رکھنے میں مشکل ہی یہ بتاتی ہے کہ شام کے منظرنامے پر صرف یہی دو طاقتیں ہی خارجی کردار نہیں ہیں۔ ترکی نے، جو امریکا کا قریبی نیٹو اتحادی ہے، کئی سالوں سے سرحد پار کر کے داعش اور دیگر اسد مخالف گروہوں سے جا ملنے والے جہادی جنگجوؤں کی طرف سے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں۔ جولائی ۲۰۱۵ء میں کہیں جا کر ترکی نے امریکی جنگی جہازوں کو اپنی سرزمین سے داعش پر حملے کرنے کی اجازت دی۔

نیٹو کے ایک سابق سیکرٹری جنرل اور یورپی یونین کے ترجمان برائے خارجہ اور سلامتی امور جیویئر سولانا کہتے ہیں کہ ''ترکی کا

مسئلہ یہ ہے کہ اس کے اہداف اتنے سیدھے سادھے نہیں ہیں، جیسا کہ داعش کو شکست دینا یا بشارالاسد کو اقتدار سے ہٹانا۔ خاص طور پر ترکی چاہتا ہے کہ کرد گروہ جیسا کہ شام کی جمہوری اتحاد پارٹی جو ترکی کی کردستان ورکرز پارٹی کے ساتھ قریبی تعلقات رکھتی ہے، شام میں زمین پر قبضہ حاصل نہ کر سکے، نہ ابھی تنازع ختم ہونے کے بعد کے تعمیراتی عمل کے دوران"۔

سولانا کی بات درست ہے۔ مگر اوباما انتظامیہ کا مخمصہ یہ ہے کہ اگرچہ وہ کردوں کے ایک صدی پر محیط ایک آزاد قومی ریاست کے خواب کے خلاف ہے، کرد "پشمرگہ" شمالی شام میں داعش کے خلاف سب سے مؤثر قوت ہے۔ امریکا میں موجود ایک فاؤنڈیشن نیو امریکا سے وابستہ تحقیقی ساتھی بارک بارفی کے مطابق اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ صرف آگ پر تیل چھڑکا جا رہا ہے۔ داعش کو شکست دینے کے لیے ساتھیوں کی تلاش میں (تاکہ امریکا کا تنازع میں اپنا براہ راست کردار کم ہو سکے)، اوباما انتظامیہ متضاد اہداف رکھنے والی پارٹیوں میں پھنس گئی۔ ایک طرف سی آئی اے باغی گروہوں کے ساتھ منسلک رہی، دوسری طرف پینٹاگون کردوں کو تربیت دیتا رہا۔ دوسری طرف امریکی عہدیدار اپنے ترک ہم منصبوں کو داعش سے سرحدی زمین حاصل کرنے پر اکساتے رہے۔ ایک دوسرے کو ختم کرنے کے بجائے ان کوششوں نے نہ ختم ہونے والے تنازعات کو جنم دیا اور شام کی تباہی کو ایک خطرناک سطح پر پہنچا دیا۔

سعودی اور ایرانی

بارفی کا تجزیہ کافی سخت ہے، شاید بہت سخت۔ ان کا کہنا ہے کہ امریکا کو ایک ہم آہنگ پالیسی بنانی چاہیے تھی، ایسی پالیسی جو بہت احتیاط کے ساتھ اتحادیوں کو منتخب کرتی اور امریکا کی زیادہ براہِ راست مداخلت پر مشتمل ہوتی۔ لیکن یہ کہنا آسان ہے اور کرنا مشکل۔ خاص طور پر عراق اور افغانستان میں امریکا کی "براہِ راست مداخلت" کے نتائج کے بعد۔

اور سب سے بڑی بات، بہتر اتحادی ہوتے بھی کون؟ سعودی عرب، جو اپنی بنیاد سے ہی امریکا کا اتحادی ہے، بشارالاسد اور داعش دونوں کا مخالف ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ داعش کے بیانیے کا اگر سب نہیں تو بہت کچھ سعودی بادشاہت کے اپنے وہابی نظریے کا عکس ہے۔ اور اگرچہ زیادہ تر حمایت سعودی حکومت کی طرف سے نہیں بلکہ سعودی شہریوں کی طرف سے ملی ہے، شام میں لڑنے والے ۵۰ باغی گروہوں کے اتحاد "جیش الاسلام" کی تخلیق سعودی عرب کا سرکاری منصوبہ تھا، جو ایسے اسلامی نظریے کو فروغ دیتا ہے، جو امریکا کو سخت ناپسند ہے۔

ظاہر بات یہ ہے کہ صرف شام کی قسمت ہی داؤ پر نہیں لگی ہوئی۔ سابق جرمن وزیرِ خارجہ اور وائس چانسلر جوشکا فشر کے مطابق، شام کی خانہ جنگی ایک نئے 'مشرقِ وسطیٰ' کے نمودار ہونے کا اشارہ ہے۔ ان کے مطابق پرانے مشرقِ وسطیٰ کے برخلاف، جس کی قسمت غالب مغربی طاقتیں متعین کرتی تھیں (جنگِ عظیم اول کے بعد برطانیہ اور فرانس اور ۱۹۴۰ء کے بعد سے اب تک امریکا)، نئے مشرقِ وسطیٰ میں کوئی خارجی اجارہ دار نہیں ہے جو اسے استحکام دے۔ اور ایک غالب مقامی طاقت کی غیر موجودگی میں ایک خطرناک خلا ابھر چکا ہے۔ فشر کے خیال میں یہ خلا نہ صرف ترکی کے ذریعے پُر ہو رہا ہے، بلکہ زیادہ اہم اور دوررس انداز میں سعودی عرب، جو سنی اسلام کا مضبوط سرپرست ہے اور ایران، جو شیعہ اسلام کا علمبردار ہے، کے ذریعے پُر ہو رہا ہے۔ مقامی بالادستی کے لیے ان ممالک کی رسہ کشی لبنان، عراق، شام اور اب یمن کے میدانِ جنگ میں جاری ہے۔

ایران کے مشرقِ وسطیٰ پر غالب آنے کی کوشش کے سعودی نظریے کو حقائق پر پرکھنا چاہیے۔ سعودی راہنما جب پڑوسی عراق کو دیکھتے ہیں تو انہیں ایران کے زیرِ اثر شیعہ اکثریتی ملک نظر آتا ہے۔ جب وہ لبنان کی طرف نظر کرتے ہیں تو انہیں شیعہ حزب اللہ پر ایران کا تسلط دکھائی دیتا ہے۔ شام میں انہیں بشارالاسد اور ان کی شیعہ سے ملتی جلتی علوی اقلیت کے لیے ایران کی حمایت نظر آتی ہے۔ اور اپنے گھر سے قریب بھی انہیں ہر جگہ ایران کا اثر و رسوخ نظر آتا ہے۔ بحرین میں سنی حکومت کے تحت شیعہ اکثریت، یمن میں شیعہ اقلیت اور اپنی ہی بادشاہت میں تیل سے مالا مال قطیف خطہ میں شیعوں کی اکثریت۔ اس تناظر میں دیکھیں تو نظر آئے گا کہ ایران کے سپریم راہنما آیت اللہ خامنہ ای مشرقِ وسطیٰ کے غالب حکمران بننے جا رہے ہیں۔ لیکن اس کا امکان بہت کم ہے۔ مسلمانوں کی ۸۵ فیصد آبادی سنی اسلام پر عمل پیرا ہے اور عرب دنیا مکمل طور پر کبھی بھی عجمی ایران اور اس کے فارسی ورثہ کے ساتھ مطمئن نہیں رہی۔ اس سب کے باوجود، غلط یا صحیح، ۳۱ سالہ قائم مقام ولی عہد اور وزیرِ خارجہ محمد بن سلمان کی موجودگی میں سعودی یہ محسوس کرتے ہیں کہ انہیں (بحرین اور یمن میں زیادہ براہِ راست کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ) شام کا مستقبل متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرنا چاہیے۔

ایک نیا سائس پیکو؟

مستقبل میں کیا ہوگا اس کا صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ فشر کی طرح کونسل آف فارن ریلیشنز کے صدر اور امریکی وزارتِ خارجہ کے سابق ڈائریکٹر برائے پالیسی پلاننگ رچرڈ این ہاس مقامی صورتِ حال پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ چار یا پانچ ممالک اس خطے میں ایسے ہیں جہاں حکومت اپنی ریاست کے قابلِ قدر حصوں پر قابو نہیں رکھتی۔ یہ کافی سنجیدہ فہرست ہے۔ لبنان دہائیوں سے اس صورتِ حال کا شکار ہے۔ عراق ایک دہائی سے زائد عرصے سے، اور شام، لیبیا اور یمن کی پانچ سال سے زیادہ عرصے سے یہی صورتِ حال ہے۔

ہاس کہتے ہیں کہ ان تمام ممالک میں جنگجو گروہ، غیر ملکی لڑاکا گروہ، دہشت گرد تنظیمیں اور دیگر مسلح گروہ مقامی حاکمیت حاصل کر چکے ہیں۔ اور کردوں کی نا تمام قومی امنگیں (جن کی بڑی تعداد ترکی، عراق، شام اور ایران میں قیام پذیر ہے) معاملات کو اور الجھا دیتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ غیر حل شدہ مسئلہ بھی موجود ہے کہ اسرائیل کی فلسطینیوں کے سیاسی اہداف کے ساتھ کس طرح مصالحت کرائی جائے۔

یہ بات واضح ہے کہ ایک صدی پہلے برطانیہ کے سر مارک سائس اور فرانس کے فرانکوئس جارج پیکو نے مشرقِ وسطیٰ کی جو قومی سرحدیں ترتیب دی تھیں، وہ اگر مٹ نہیں رہیں تو معدوم ضرور ہو رہی ہیں۔ درحقیقت اگر داعش جیسی تنظیم، جس کے قبضے میں عراق سے شام تک کی سرزمین ہے، کمزور بھی ہوتی ہے، تب بھی ہاس کی بات درست ہے کہ کسی بھی سطح کی کوشش خطے کی بنیادی حقیقت کو بدل نہیں سکتی، یعنی سرحدیں معنویت کھو چکی ہیں اور حکومتوں کا اختیار بہت تھوڑا رہ گیا ہے۔ نقشے پر موجود ممالک کو اکٹھا کر کے اور ان کے درمیان سرحدوں کو بامعنی بنا کر مشرقِ وسطیٰ کو واپس لانے کی کوئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہوگی، کیونکہ علاقائی، مذہبی، قبائلی، نسلی اور نظریاتی وابستگیاں قومی شناختوں سے زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہیں۔

لیکن اس حقیقت پسندی کا یہ مطلب نہیں کہ سیاست دان اور سفارت کار آرام سے بیٹھ جائیں۔ بین آمی کہتے ہیں کہ شام میں ایک حل، جو روس نے پیش کیا ہے، وہ وفاقی نظام کا ہے۔ روس جس زمینی تقسیم کی بات کر رہے ہیں۔ وہ ایک ایسے نظام کی بنیاد بن سکتی ہے۔ اس تناظر میں بشارالاسد کے علوی مغربی زمین پر، جو شمال میں لاتاکیہ سے جنوب میں دمشق تک پھیلی ہوئی ہے، حکومت کر سکتے ہیں، اور شمال مشرق میں

ایک خودمختار شامی، کردی علاقہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ جبکہ باقی ملک سنی مخالفین کے حوالے کیا جاسکتا ہے۔

کیا مجرموں کو سزا ملنی چاہیے؟

بین آمی کی رائے شام کو پہلے والی صورتِ حال پر بحال کرنے سے یقیناً زیادہ قابلِ غور ہے اور عراق اپنے خودمختار کرد علاقے کے ساتھ پیروی کرنے کے لیے ایک مثال ہے۔ مگر ۱۱ ملین شامی، جو تنازع سے پہلے کی آبادی کا نصف ہے، اپنے گھروں سے نکالے جاچکے ہیں۔ چار لاکھ کے قریب قتل ہوچکے ہیں، پورے پورے شہر تباہ ہوچکے ہیں، اور عیسائی اور دوسری اقلیتیں جن کو پہلے بشارالاسد کی سیکولر حکومت میں تحفظ حاصل تھا، اب داعش اور دیگر اسلامی جہادی گروہوں کے رحم و کرم پر ہیں۔ متاثرین اور مجرموں کے درمیان انصاف کے بغیر کیا کوئی حل ممکن ہے؟

ہیومن رائٹس واچ کے بانیوں میں سے ایک آریے نیئر بضد ہیں کہ جنہوں نے زیادتیاں کی ہیں ان سے حساب لیا جانا چاہیے، بشمول شامی حکومت کے جو سب سے زیادہ زیادتیاں کرنے کی مجرم ہے۔ نیئر کہتے ہیں کہ چار سال پہلے ان کی جانب سے شام پر ایک عرب ٹریبونل بنانے کی پکار بے سود ثابت ہوئی۔ صاف طور پر بہت سی عرب حکومتوں کو یہ خوف تھا کہ شام کے لیے قائم ہونے والی عدالت ایک مثال بن سکتی ہے، جو بعد ازاں خطے میں دیگر جگہوں پر بھی جرائم کا حساب لینے کی کوشش کرسکتی ہے۔ یمن کی جنگ میں ہونے والے مظالم یا مصری صدر عبدالفتح السیسی کی طرح کی ظالم حکومتوں کی طرف سے ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے ہوتے ہوئے ایسی کوئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہوگی۔

لیکن نیئر ناامید ہونے کے لیے تیار نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ 'سچائی کمیشنز' کچھ بھی نہ ہونے سے بہتر ہیں۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ جنگی جرائم میں ملوث افراد کو صرف نشانہ بنانے سے مجرمانہ سزائیں نافذ نہیں ہوسکیں گی۔ لیکن اس طرح کم از کم ایک طرح کی جواب دہی ہوگی۔ اور یہ اقدام بعد میں مجرموں پر گرفت کی بنیاد بن سکے گا۔ یہ جاننے کے بعد کہ کس نے کون سا جرم کیا، ممکن ہے مجرموں کو سزا دینے کے لیے ٹریبونل بنانے کے مطالبے کو بڑھاوا دے۔ مزید یہ کہ ان کو نمایاں کرنے سے جنہوں نے انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی، ان دیگر لوگوں کو عبرت ہوسکتی ہے جو مستقبل میں خود کو انسانی حقوق کا مجرم نہیں دیکھنا چاہتے۔

مگر کم از کم ان حکمرانوں کے لیے جن کی جسمانی بقا طاقت میں رہنے پر منحصر ہے، اس قسم کی دھمکی بے فائدہ ہے (مثال کے طور پر سوڈان کے صدر عمر البشیر بے فکری سے اپنے انسانیت کے خلاف جرائم کی وجہ سے جاری ہونے والے بین الاقوامی گرفتاری وارنٹ کو نظر انداز کیے ہوئے ہیں) اگرچہ انسانی حقوق کے ساتھ وابستگی متقاضی ہے کہ آواز اٹھائی جائے، لیکن اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ ایسا کرنا بشارالاسد کو حلب کو نقشے سے مٹانے کی کوشش سے باز رکھے گا۔ ۲۰۱۱ء میں لیبیا میں 'حفاظت کی ذمہ داری' والے نظریے کے اجرا کی طرح کوئی نظریہ بھی جاری نہیں ہورہا جو اقوامِ متحدہ نے ۲۰۰۵ء میں انسانی ہمدردی کی بنیاد پر بین الاقوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے بنایا تھا اور جس کا مقصد مظالم کو روکنا تھا۔ تو اگر جوزف اسٹالن کے الفاظ میں کہا جائے تو ''ہیومن رائٹس واچ کو کتنی ڈویژنز ملی ہیں؟''

ایک وسیع تر منظر نامہ

یہ پورا منظر ہمیں دوبارہ دو مرکزی خارجی کرداروں کی طرف لے جاتا ہے یعنی امریکا اور روس، جیسا کہ نیو امریکا کی صدر اینے مارے سلاٹر کہتی ہیں کہ یہ دونوں مختلف گروہوں کو مدد دے رہے ہیں اور یہ یقینی بنانے کی کوشش کررہے ہیں کہ کثیر الفریقی تنازع میں ان کے اتحادی آگے بڑھتے رہیں یا کم از کم اپنی زمین پر قائم رہیں۔

اگرچہ یوکرین کے اوپر دونوں ممالک کے اختلافات شام پر ان کے مذاکرات کو یقیناً تلخ بناتے ہیں، سلاٹر اس موضوع سے اعراض کرتی ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ شام کے مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے ایک وسیع تر کوشش کی ضرورت ہے۔ ان کے مطابق 'ایسے ممالک کا اتحاد کارآمد ہوسکتا ہے جو ابھی براہِ راست تنازع میں ملوث نہیں۔ ایسا اتحاد جرمنی، بھارت، جاپان، برازیل اور مصر پر مشتمل ہوسکتا ہے اور بشارالاسد کے مرکزی مددگار صدر ولادی میر پیوٹن کو یہ باور کرا کے کہ ان کا وقار داؤ پر ہے، سنجیدہ مذاکرات کے لیے اسد پر دباؤ بڑھا سکتا ہے۔

سلاٹر کی تجویز دلچسپ ہے لیکن کیا اس سے کوئی نتیجہ برآمد ہوگا؟ جیسا کہ وہ خود کہتی ہیں کہ بہت سے ممالک کی حکومتیں کہیں گی کہ شام کا مسئلہ انہیں براہِ راست متاثر کرنے سے بہت دور ہے۔ درحقیقت جیسا کہ برنارڈ ہنری کہتے ہیں کہ حال ہی میں شام میں ظلم اپنی انتہائی حدوں سے بڑھ جانے کے خطرے کے باوجود، یورپ کے لیے موجودہ خطرات پناہ گزینوں کی تعداد میں اضافے سے شروع ہوتا ہے اور یورپی لیڈر اپنے ہی مسئلوں میں الجھے ہیں۔

اسلام کے لیے جنگ

سابق برطانوی وزیرِ اعظم ٹونی بلیئر پورا اتفاق رکھتے ہیں کہ شام کا مسئلہ ہم سب کو متاثر کرتا ہے۔ بالآخر اب وہاں اصل تنازع سیکولرزم (ڈکٹیٹر شپ کے تحت ہی سہی) اور اسلامی قوتوں کے درمیان ہے جو معتدل سے لے کر انتہا پسند تک کی قسموں میں موجود ہیں۔ اور یہ تنازع شام تک ہی محدود نہیں۔ پاکستان سے لے کر کیلیفورنیا تک میں حملوں کی مثال دے کر بلیئر کہتے ہیں کہ اسلامی انتہا پسندی سے نمٹنے کے لیے بین الاقوامی برادری کو ایک مربوط حکمتِ عملی کی ضرورت ہے، ایسی حکمتِ عملی جس میں طاقت، سفارت اور تعمیر ایک مستحکم دنیا حاصل کرنے کے لیے مل کر کام کریں۔

ٹونی بلیئر تعمیری روش کی بات کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں سمجھنا چاہیے کہ مشرقِ وسطیٰ اور اسلام ایک تبدیلی کے عمل میں ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ اصولوں کی حکمرانی اور مذہبی برداشت والا معاشرہ بننے کے عمل میں ہے اور اسلام اپنی اصل جگہ یعنی ترقی اور انسانیت کا دین بننے کے۔ اس تناظر سے دیکھیں تو مشرقِ وسطیٰ کی افراتفری بالعموم اور شام کی تباہی بالخصوص اعراض برتنے کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ زندگی اور موت کی جنگ ہے، جس میں ہمارے بنیادی مفادات داؤ پر لگے ہوئے ہیں۔

یہ بات اس پورے سال کے درمیان مزید واضح ہوئی ہے اور اسی طرح بلیئر اسرائیل فلسطین کے مسئلے کو حل کرنے کی بات کرنے میں بھی حق بجانب ہیں۔ ان کے خیال میں ایسا ہونا نہ صرف بذاتِ خود بہتر ہوگا بلکہ اچھے بین الاقوامی اور بین المذہبی تعلقات کو بھی فروغ دے گا اور قوت کے ساتھ پُرامن بین الاقوامی فضا کا اصول ہے۔

لیکن پریشان کن حقیقت یہ ہے کہ قریب میں کوئی اسرائیل فلسطینی معاہدہ نظر نہیں آتا، نہ ہی سعودی عرب اور ایران میں کوئی مصالحت ہوتی دکھائی دیتی ہے اور حالیہ جنگ بندی کے فوراً ختم ہوجانے کے بعد روس اور امریکا مزید دور ہوچکے ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ جو کردار شام کی تباہی کو روک سکتے ہیں، ان میں سے اب بھی بیشتر دانشمندانہ کردار ادا کرنے کے لیے متبادل تلاش کررہے ہیں۔ (ترجمہ: طاہرہ فردوس)

"Syria's shattered mosaic".
("project-syndicate.org". oct 7th 2016)

●●●

لبنان: مردم شماری اور سمجھداری

کچھ لبنانی سیاستدانوں نے لبنان کے سیاسی طوفان کا مائیکل عون سے بہترطور پر سامنا کیا ہے۔ ۸۱ سالہ مائیکل عون کا سفر طویل خانہ جنگی کے اختتام پر جنگی سردار سے شروع ہوتا ہوا وزیراعظم کی کرسی تک گیا۔ ۱۹۹۰ء میں شام میں جنگ سے پہلے انہیں جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ کافی سالوں بعد وہ لبنان کی عیسائی سیاسی طاقتور تنظیم کے سربراہ کی حیثیت سے لوٹے اور ۳۱/اکتوبر کو لبنان کے تیرہویں صدر بنے۔

لبنان کا صدر منتخب ہونے کے لیے انہیں دو سال سے زیادہ کا عرصہ لگا اور ۴۵ مرتبہ صدر بننے کی ناکام کوشش کے بعد کامیابی حاصل ہوئی۔ سیاسی نظام تعطل کا شکار ہوکر مفلوج ہوگیا تھا۔ شامی پناہ گزینوں کی آمد کی وجہ سے لبنان پہلے ہی بنیادی سہولیات میں کمی اور فیصلہ سازی میں توڑ پھوڑ کا شکار تھا۔ شامی مہاجرین کی آمد نے لبنان کی سیاسی نظام کی خامیوں اور کوتاہیوں کو کھول کر رکھ دیا۔

سلطنت عثمانیہ سے علیحدگی کے بعد مشرق وسطیٰ میں لبنان عیسائیوں کی پناہ گاہ کے طور پر تصور کیا جاتا تھا۔ کئی دہائیوں تک جاری رہنے والی جنگ، کم شرح پیدائش اور مسلسل ہجرت کی وجہ سے لبنان میں عیسائیوں کی تعداد میں واضح کمی آئی۔ لیکن ان کا سیاسی اثر ورسوخ باقی رہے۔

۱۹۷۵ء سے ۱۹۹۰ء تک کی خانہ جنگی سے پہلے مسلمانوں کی طرف سے دی جانے والی پارلیمان کی چھ مخصوص نشستوں پر عیسائی موجود تھے اور یہ نشستیں انہیں ۱۹۳۲ء کی مردم شماری کی بنیاد پر دی گئیں تھیں۔ تعلیمی جائزوں کے مطابق اس وقت لبنان میں کل آبادی کا نصف عیسائی آبادی ہے، لیکن عیسائیوں کی بڑی تعداد میں ہجرت اس اعداد وشمار پر ایک سوالیہ نشان ہے۔

طائف معاہدے کے تحت جنگ کے اختتام پر نشستیں برابری کے ساتھ طے کر لی گئی تھیں۔ مسلمانوں کی ہر پانچ نشستوں پر عیسائیوں کو پانچ نشستیں دی گئی تھیں، اس وقت یہی سمجھا گیا کہ ابھی تک عیسائیوں کی نمائندگی زیادہ ہے حالانکہ ۱۹۳۲ء کے بعد مردم شماری نہیں کی گئی۔ ''دی اکنامسٹ'' سے حاصل کیے گئے حکومتی اعداد وشمار یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یکطرفہ طور پر حاصل کیے گئے ان اعداد وشمار کو کس طرح موجودہ صورتحال سے جوڑا جارہا ہے۔ حاصل معلومات کے مطابق یہ اعداد وشمار درج شدہ ووٹوں سے حاصل کیے گئے ہیں، جن کے مطابق لبنان میں ۳۷ فیصد عیسائی آبادی ہے۔ حیرت انگیز طور پر لبنان میں نئے سرے سے مردم شماری کی مخالفت کی جارہی ہے اور اس سے خوف محسوس کیا جارہا ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ خوف ملک میں موجود کشیدگی کو ہوا دے اور فرقہ واریت کی آگ کو بھڑکا دے۔

پروگریسو سوشل پارٹی کے چیئرمین کے مطابق مردم شماری بہت سی چیزوں کے لیے واضح تبدیلی کا سبب بنے گی۔ یہ بہت حساس موضوع ہے اور یہ بہت سارے مسائل بھی پیدا کرے گی۔ مردم شماری لبنان میں رہنے والے بہت سے طبقات میں بے چینی کا سبب بنے گی اور یہاں پہلے ہی شیعہ برادری کے ساتھ کشیدگی برقرار ہے اور حالیہ پس منظر مردم شماری کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔

دی اکنامسٹ نے درج شدہ ووٹوں کی فہرست حاصل کی ہے، جس میں ۳٫۶ ملین ووٹر اور ان کے مذہبی رجحان سے متعلق معلومات درج ہیں۔ درج شدہ ووٹر کی فہرست کو وزارت داخلہ کی ویب سائٹ پر شائع ہونے کے بعد سے عیسائیوں کی لبنان میں تیزی سے کم ہوتی ہوئی آبادی کو موضوع بحث بنا کر مردم شماری پر زور دیا جارہا ہے۔

اعداد وشمار کے مطابق میرونیٹ کیتھولک جو کہ ماضی میں آبادی کا ایک بڑا حصہ تھا، اب اس کے صرف ۲۱ فیصد ووٹ درج ہیں۔ زیادہ ووٹروں کا سہرا ۲۹ فیصد کے ساتھ اب شیعہ آبادی کے سر ہے جب کہ سنی ووٹر ۲۸ فیصد ہیں۔ عیسائی آبادی کل آبادی کا سب سے کم ہے، تاہم ۱۲۸ سیٹوں میں ۳۴ یعنی سب سے زیادہ سیٹ انہی کے پاس ہیں، جبکہ سنی نمائندے ۲۷/اور شیعہ آبادی کے نمائندے بھی ۲۷ ہیں۔

لبنان میں جب بھی تشدد کی آگ بھڑکتی ہے تو اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے گرچہ کے اس عدم توازن کو مکمل طور پر امن میں تبدیل نہیں کیا جاسکا ہے۔ طائف معاہدے نے میرونیٹ آبادی سے صدارت، پارلیمان کے اسپیکر اور وزیراعظم کی مضبوط سیٹیں چھین لیں اور ان کی اصل طاقت کا پول کھول کر رکھ دیا ہے۔ پہلے یہ سیٹیں بالترتیب سنی اور شیعہ آبادی کے پاس ہوتی تھیں۔ ۲۰۰۸ میں تشدد کی لہر کے بعد دوحہ میں ہونے والے سمجھوتے کے بعد حزب اللہ نے شیعہ آبادی کی نمائندگی کرتے ہوئے حزب اختلاف کا کردار ادا کرتے ہوئے فیصلہ سازی کے لیے ویٹو کا حق حاصل کیا پارلیمان کا غیر فعال ہونا، صدر کی دو سالہ مدت اور اس کی کارکردگی پر سوالیہ نشان ہے اور یہی وجہ ہے کہ صورتحال اب طاقت کی تقسیم کے سمجھوتوں اور معاہدوں کے لیے سازگار ہے۔

ارکان پارلیمان کے انتخابات میں تاخیر لبنان کے ٹوٹے پھوٹے سیاسی نظام کو مزید مشکلات سے دوچار کردے گی۔ ووٹروں کی فہرست میں معلومات کے ساتھ ووٹروں کی عمر بھی درج ہے جس سے یہ بات ظاہر ہے کہ اب آبادی کی اکثریت مسلم نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ عیسائی آبادی کے لیے ابھی یا آنے والے سالوں میں پارلیمان پر اپنا کنٹرول قائم رکھنا بہت مشکل ہے۔ آنے والے انتخابات میں مسٹر عون طائف کے معاہدے میں کھو جانے والی صدارتی کرسی پر اگر دوبارہ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے کوئی راستہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں تو انہیں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اگرچہ تبدیلی بہت مشکل ہے۔ کوئی بھی نیا فارمولا پارلیمانی جماعتوں میں کشیدگی کو بڑھا سکتا ہے، جسے پورے لبنان میں کوئی بھی پسند نہیں کرے گا۔ واشنگٹن تھنک ٹینک سے تعلق رکھنے والے مڈل ایسٹ انسٹی ٹیوٹ کے رکن کے مطابق ''پارلیمان میں عیسائیوں کی تعداد پچاس فیصد ہے، وزیراعظم آفس سنیوں کے پاس ہے اور حزب اللہ اس وقت شام میں مصروف ہے اور جو شخص اس وقت لبنان کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہے، اسے لبنان میں یا اس کے حالات کو سنوارنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور یہی صورتحال مزید تصادم کی طرف لے جائے گی۔

جب سے پڑوسی ملک شام میں جنگ شروع ہوئی ہے، لبنان میں ایک ملین پناہ گزین آباد ہو چکے ہیں، یہ لبنان کی کل آبادی کا ایک چوتھائی ہیں۔ ان پناہ گزینوں کی ایک بڑی تعداد سُنّی ہے۔ پناہ گزینوں کے اس طوفان کو روکے بغیر انہیں تمام تر شہری حقوق دینا لبنانی حکومت کے لیے ناممکن ہے، جبکہ اس وقت ایک متوازن حکومت کا قیام بھی مشکل کام ہے۔ اسی طرز کا ایک اور مسئلہ ۱۹۴۸ء سے لبنان کو درپیش ہے، جب فلسطینیوں نے لبنان میں پناہ لینی شروع کی تو لبنان کی حکومت نے انہیں روزگار حاصل کرنے کے لیے سخت شرائط عائد کردیں، جس نے لبنان میں انتہا پسندی کو فروغ دیا۔

لبنان میں عیسائی اپنے ہی وطن میں بدلتی اقلیت اور اقتدار میں دوسری جماعتوں کی اکثریتی شراکت سے پریشان ہیں۔ پارلیمان میں عیسائیوں کی زیادہ نمائندگی ہوسکتا ہے کہ اگلے ایک یا دو عشروں کے لیے قابل قبول ہو اور ہوسکتا ہے کہ اسے بالکل بھی برداشت نہ کیا جائے۔ لبنان کے حکومتی حلقوں میں ایک چیختی ہوئی خاموشی گونج رہی ہے اور سر پر گھمبیر مسئلوں کی تلوار لٹک رہی ہے اور یہ صورتحال ہی مشرق وسطیٰ کو خونریزی کی طرف دھکیل رہی ہے۔ (ترجمہ: سمیہ اختر)

"Lebanon: Census and sensibility"
("The Economist". Nov.5, 2016)

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950